ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۲۶ اپریل ۔ ۳ مئی ۱۹۷۳ء

The beauty of language is in its pronunciation.

یوم مئی کے شہیدوں کو سلام



قیمت ——— ۵۰، پیسے
ہوائی ڈاک سے ـــ ایک روپیہ

محنت کشوں کا بین الاقوامی گیت

انٹرنیشنل

ترجمہ : انور شعور

اٹھو، بھوک کے ناداری کے اسیرو
اٹھو گیتی کے بدبختو
سورج اب انصاف کا روشن ہونے والا ہے
اب ایک اچھی بہتر دنیا پیدا ہونے والی ہے
ہمارے پیروں میں زنجیریں نہیں رہیں گی، روایتوں کی
اٹھو غلامو! آج غلامی موت کے دروازے پر کھڑی دم توڑ رہی ہے
ہاں اب دنیا ایک نئی بنیاد پہ قائم ہوگی
ہم تم اب تک کچھ بھی نہیں تھے، لیکن اٹھو اب ہم سب کچھ ہو جائیں
یہ جنگ آخری جنگ ہے
آؤ ہم سب اپنا اپنا محاذ سنبھالیں
ہوگا انسانیت کا نقیب انٹرنیشنل
یہ جنگ آخری جنگ ہے
آؤ ہم سب اپنا اپنا محاذ سنبھالیں
ہوگا انسانیت کا نقیب انٹرنیشنل

خداکی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

مدیر
وہاب صدیقی

۲۶ اپریل - ۳ مئی ۱۹۷۳ء

قیمت : ---- ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ---- ایک روپیہ

جلد - ۳ شمارہ - ۵۰

ادارئیہ

پاکستانی جنگی قیدی اور بھارت

پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی کا مسئلہ گذشتہ ۱۶ ماہ سے کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ پاکستانی فوجیوں نے بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے، اس لئے ان کی واپسی کا مسئلہ بھارت ہی کی کوششوں سے حل ہوسکتا تھا۔ لیکن وہ اپنی روائتی ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ الجھانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے یہ بے جان موقف اختیار کیا تھا کہ پاکستانی فوج نے مکتی باہنی کے سامنے بھی ہتھیار ڈالے تھے اور اس طرح بنگلہ دیش کی حکومت سے "منظوری" حاصل کئے بغیر بھارت پاکستانی جنگی قیدیوں کو واپس کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

بھارت کا یہ رویہ غیر متوقع نہیں ہے۔ وہ اپنے چھوٹے پڑوسی ممالک سے اسی قسم کی زبان میں بات کرتا ہے. گذشتہ دنوں سکم میں اُس نے جس ڈھٹائی کے ساتھ جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ اس کے جرائم کی طویل فہرست میں محض ایک معمولی اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کے تمام پڑوسی ممالک اس کے مطیع رہیں، اور اس کے اشاروں پہ ناچیں۔ اس کی افواج کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور وہ مشرقی پاکستان میں اپنی کامیابی کے بعد اور شیر ہوگیا ہے۔ اس سلسلے میں اُسے روس کی آشیر باد حاصل ہے، جو ایک طویل عرصے سے بھارت کے ذریعے اس علاقے کے تمام ممالک پہ اپنا سیاسی اور معاشی تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی کے لئے بھارت کو

خاص مضامین

سرورق : انور سمیع

فون : ۴۱۲۲۷۴

ا ڈیٹر اور پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸ ڈی - نرسری کمرشیل ایریا (پی - ای - سی - ایچ - ایس) کراچی ۲۹ سے شائع کیا

بنگلہ دیش کی منظوری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جب چاہے مجیب الرحمٰن سے ایسے کسی بھی فیصلے پر "انگوٹھا" لگوا سکتا ہے۔ اس التواء کا اصل مقصد یہ ہے کہ بھارت پاکستان کو اپنے آگے زیادہ سے زیادہ جھکانا چاہتا ہے اور اخلاقی طور سے اسے مضمحل کرنا چاہتا ہے۔ وہ فاتح کا لہجہ اختیار کر رہا ہے، اور بڑی ڈھٹائی کے ساتھ طاقت کی زبان استعمال کر رہا ہے۔ یہ سیاسی بلیک میلنگ کا بہت آسان نسخہ ہے۔ تمام توسیع پسند ممالک اپنے پڑوسی چھوٹے ممالک سے اسی قسم کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اور بھارت تو اس ہتھکنڈے کا چیمپئن ہے

بھارتی سیاست دان یہ دعویٰ کرتے ہیں، کہ انہوں نے محض انسانی جذبات کے احترام میں عوامی لیگ کی حمایت کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا تھا اور اُسے اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ وہ بنگلہ دیش کی آزادی کا سب سے بڑا پرچارک بن بیٹھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اُس نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں پر غاصبانہ قبضہ کیا، اس وقت اسے اس انسانی اصول کا احساس کیوں نہیں ہُوا؟ جب اُس نے اپنے پڑوسی ممالک پاکستان، چین، نیپال، سیلون اور برما کے خلاف سیاسی محاذ آرائیاں کیں، اس وقت اس کا امن پسندی کا فلسفہ کہاں تھا۔ کشمیر اور ناگالینڈ کے سلسلے میں اس کی حریت پسندی کیوں نہیں جاگی؟ سکم کے حق خود اختیاری کا "احترام" اس نے وہاں اپنی فوجیں بھیج کر کیوں کیا؟

بھارتی سیاست دان جمہوریت کے بہت بڑے پرچارک بنے بیٹھے ہیں۔ لیکن وہاں جس طرح جمہوریت کا قتلِ عام ہو رہا ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ نکسل باڑی تحریک کو جس پیمانے پر تشدّد کا نشانہ بنایا گیا، وہ بھارتی فسطائیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بھارت ان ممالک میں سے ہے جنھیں دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آجاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ پاکستان کی مختلف قومیتوں کے "حقوق" کے لئے بھارتی سیاست دان ایک طویل عرصہ سے شور مچا رہے ہیں۔ سرحد اور بلوچستان میں گورنر راج قائم کیا گیا تو ان کا انسانی جذبہ بہت تیزی سے بیدار ہوا۔ انہیں بہت دُکھ پہنچا۔ آکاش وانی مگر مچھ کے آنسو بہانے لگا۔ لیکن کوئی ان "جمہوریت پسندوں" سے پوچھے، تم جب اپنے صوبوں کی اکثریتی پارٹیوں کو نظر انداز کرکے وہاں گورنر راج قائم کرتے ہو، اس وقت تمہیں کوئی اصول کیوں نہیں سُجھتا؟

بھارت اور روس ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ روسی حکومت بھی انسانی اور جمہوری اصولوں کا بہت "احترام" کرتی ہے۔ مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کے تسلّط سے اُسے بہت دُکھ پہنچا۔ سرحد اور بلوچستان میں گورنر راج قائم ہونے پر اس کے دل پر برچھی لگی۔ یہ بڑا قابل احترام جذبہ ہے۔ لیکن ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ ہنگری، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ اور البانیہ پر تم نے اپنا سیاسی اور معاشی تسلّط قائم کرنے کے لئے کون سی کسر اُٹھا رکھی؟ جب تمہارے ٹینک پولینڈ اور چیکو سلواکیہ کی سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہیں، اس وقت تمہارا پرامن بقائے باہمی کا اصُول ہوا میں کیوں بکھر جاتا ہے؟ جب روسی قومیت اقلیتی قومیتوں پر سیاسی اور معاشی تسلّط قائم کرتی ہے، اس وقت مساوات کا نظریہ تمہیں کیوں یاد نہیں آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ روس اور بھارت، جن کا شمار دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں ہوتا ہے۔ زور اور جبر کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں بھی جنگل کا قانون چل رہا ہے۔ جو طاقتور ہے، وہ سرخرو ہے، جو کمزور ہے، وہ نکّ سر ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانیت اور جمہوریت دوست قوتیں ہمیشہ ان "لاٹھی والوں" کے خلاف جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک اعلیٰ قوتوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے ہیں، اور وہ ہر ایسے مرحلے پر ان کے خلاف مزاحمت کریں گے جب وہ من مانے طور پر اپنے فیصلے ان پر تھوپنے کی کوشش کریں گے۔ پاکستان اگر اپنے وجود کو قائم رکھنا چاہتا ہے تو اُسے تیسری دنیا کے ممالک سے قریبی رابطہ قائم کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے۔ اگر پاکستان کی خارجہ پالیسی میں اس نکتے کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا تو ہمارا ملک یونہی مستقل خطرات سے گھرا رہے گا۔

گذشتہ دنوں دہلی میں بھارت اور بنگلہ دیش کے وزرائے خارجہ کا خصوصی "سمیلن" چار دن تک جاری رہا۔ اس "سمیلن" کے بعد دہلی اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اس اعلامیہ کی رو سے ان دونوں ممالک نے اس بات پر اتفاق کا اظہار کیا ہے کہ پاکستانی جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ اور پاکستان میں مقیم دو لاکھ بنگالیوں کے بدلے بنگلہ دیش کے دو لاکھ ساٹھ ہزار بہاریوں کو پاکستان روانہ کر دیا جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی رکھی گئی ہے کہ بنگلہ دیش جن پاکستانیوں پر

باقی صفحہ (۶) پر ملاحظہ فرمائیں

پاکستانی جنگی اسیروں کے اخراجات کا بِل لبیا ادا کریگا

جنگی قیدی اگست میں واپس آ رہے ہیں

واقفِ حال

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب پاکستان پیپلز پارٹی نے اقتدار سنبھالا تو اس وقت پاکستان کا مستقبل مخدوش تھا۔ وطنِ عزیز چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ اور بقول صدر بھٹو پاکستان کی تاریخ ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ ملک میں خطرناک بحران بلکہ مہلک بحران آچکا تھا۔ صدر بھٹو کو تاریخ کے چیلنج کا مقابلہ کرنا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جمع کر کے "نیا پاکستان" بنانا تھا۔ اس وقت پاکستان کو یہ اہم مسائل درپیش تھے۔

۱۔ پاکستانی علاقوں سے بھارتی فوج کا انخلاء۔

۲۔ ۹۳ ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کی واپسی۔

۳۔ بیرونِ ملک پاکستان کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کرنا۔

۴۔ آئین بنانا، تاکہ آئینی اور قانونی حکومت قائم ہو سکے۔

صدر بھٹو نے وقت کا چیلنج قبول کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے مختلف ممالک کے دورے کئے۔ ان دوروں کا مقصد صرف سفارتی اور دوستانہ تعلقات کو نئی بنیادوں پر استوار کرنا ہی نہیں تھا، بلکہ دوست ممالک کو اس بات پر راضی کرنا بھی تھا کہ وہ پاکستانی علاقوں سے بھارتی افواج کے انخلاء، اور پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور بھارت پر دباؤ ڈالیں۔ عوامی جمہوریہ چین اور عرب ممالک کے دوروں کے نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے۔ البتہ دورۂ ماسکو کے نتائج اتنے اچھے نہیں تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سوویت وزیرِ اعظم کوسیجن نے کہا کہ "اگر برصغیر میں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تو سوویت یونین وہی کردار ادا کرے گا، جو اس نے بنگلہ دیش کے سلسلے میں ادا کیا ہے"۔ ماسکو سے اس قسم کے جواب کی توقع بھی تھی۔ کیونکہ وہ بھارت کا اتحادی ہے۔ اس سے فوجی معاہدہ بھی کر چکا تھا اور اس نے مشرقی پاکستان میں بھارتی مسلح جارحیت کا اعلانیہ اور کھل کر ساتھ دیا تھا۔

بیرونِ ممالک پاکستان کی ساکھ بحال کرنے کے بعد صدر بھٹو نے بھارت کا رخ کیا، اور مذاکرات کے لئے شملہ گئے۔ شملہ مذاکرات میں پاکستان اور بھارت کی پوزیشن میں زمین آسمان کا فرق تھا، صدر بھٹو ایک شکست خوردہ ملک کی نمائندگی کر رہے تھے۔ بھارتی توسیع پسند پاکستان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی مرضی کا سمجھوتہ مسلط کرنا چاہتے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ پاکستان سے بنگلہ دیش تسلیم کروالیں، اور انہوں نے ۹۳ ہزار جنگی قیدیوں کو ترپ کے طور پر استعمال کیا۔ ان کی رہائی کو بنگلہ دیش کی منظوری سے مشروط کر دیا۔ لیکن اس نازک موقع پر صدر بھٹو نے ماہر ڈپلومیٹ ہونے کا ثبوت دیا۔ اور بھارت کو فوجوں کے انخلاء پر رضامند کر لیا۔ شملہ سے واپسی پر صدر بھٹو نے عوام کو بتایا کہ انہوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں بھارت کی کوئی شرط قبول نہیں کی ہے، اور معاہدہ شملہ، ایک باعزت سمجھوتہ ہے۔

لیکن بعد میں حکومت کی جانب سے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی مہم چلائی گئی۔ سرکاری ذرائع ابلاغِ عامہ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے پروپیگنڈہ کیا گیا۔ اس سے عوام میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ شملہ میں بنگلہ دیش تسلیم کرنے کا یقین دلایا گیا تھا۔ حکومت نے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے حق میں جو مہم چلائی، اس میں کہا گیا کہ بنگلہ دیش تسلیم کرنے سے جنگی قیدی واپس آجائیں گے۔ مشرقی پاکستان میں خرچ ہونے والے غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ جماعت اسلامی نے اس کے جواب میں "بنگلہ دیش نامنظور" تحریک چلائی۔ لیکن یہ تحریک اصولوں کی بنیاد پر نہیں تھی، تضادات کا مجموعہ تھی۔ ایک طرف تو جماعت اسلامی یہ کہتی تھی کہ بنگلہ دیش تسلیم نہ کرو، وہ پاکستان کا اٹوٹ انگ ہے۔ دوسری طرف وہ بہاریوں کو مغربی پاکستان بلوانے کا مطالبہ کرتی تھی۔ عقل کے ان اندھوں سے کوئی پوچھے کہ اگر بنگلہ دیش، پاکستان کا اٹوٹ انگ ہے۔ ایک حصہ ہے تو وہاں سے بہاریوں کو بلوانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ملک کے ایک صوبے میں انتشار اور خلفشار پھیل جائے، تو عوام کو دوسرے صوبوں میں منتقل نہیں کیا جاتا۔ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

بہرحال پاکستانی عوام بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ کراچی کے جلسہ عام میں انہوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

یہ تو تھے اندرونِ ملک کے حالات، دوسری جانب بنگلہ دیش کے حامی ممالک بنگلہ دیش کو اقوامِ متحدہ کا رکن بنانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ اس کے لئے سلامتی کونسل میں باقاعدہ ایک قرارداد پیش کی گئی، جسے پاکستان کے عظیم دوست چین نے ویٹو کر دیا۔ اس کے بعد سلامتی کونسل نے ایک دوسری قرارداد منظور کی، جس میں اقوامِ متحدہ میں بنگلہ دیش کے داخلے اور پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دیا گیا۔

اس قرارداد کی منظوری کے بعد بھی صدر بھٹو، پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے رہے انہوں نے ہر سطح پر کوشش کی، عالمی طاقتوں سے رجوع کیا۔ اور عرب ممالک سے رابطہ قائم کیا۔ آخر کار ان کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ عالمی طاقتوں نے بھارت اور بنگلہ دیش پر دباؤ ڈالا۔ ۱۷ر اپریل کو بھارت نے پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے نئی پیش کش کی۔ یہ پیش کش بھارت کے وزیرِ خارجہ سردار سورن سنگھ اور بنگلہ دیش کے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر کمال حسین کے مشترکہ اعلامیہ میں کی گئی، جس میں کہا گیا کہ "بھارت اور بنگلہ دیش، پاکستانی جنگی قیدیوں و شہری نظربندوں، پاکستان میں مقیم بنگالیوں اور بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے بہاریوں کی بیک وقت واپسی کے لئے تیار ہے۔ تاہم ان پاکستانی جنگی قیدیوں کو رہا نہیں کیا جائے گا، جن پر بنگلہ دیش جنگی جرائم کے تحت مقدمہ چلانا چاہتا ہے۔" پاکستان میں اس وقت تقریباً دو لاکھ بنگالی ہیں جبکہ حکومتِ بنگلہ دیش کے مطابق بنگلہ دیش میں ۶ لاکھ بہاری ہیں۔ جن میں سے صرف ۲ لاکھ ۶۰ ہزار مغربی پاکستان آنے کے خواہش مند ہیں۔ اس اعلامیہ کے فوراً بعد ڈھاکہ میں سرکاری طور پر بتایا گیا کہ حکومت بنگلہ دیش ۱۹۵ پاکستانی جنگی قیدیوں اور شہری نظربندوں پر جنگی جرائم کے تحت مقدمہ چلائے گی۔ ان میں جنرل نیازی اور میجر راؤ فرمان علی بھی شامل ہیں۔ ان پر نسل کشی، قتل اور زنا بالجبر کے الزام میں مقدمات چلائے جائیں گے۔ سرکاری بیان میں یہ بھی کہا گیا کہ پاکستانی جنگی قیدیوں پر اگلے ماہ کے آخر میں ایک خصوصی ٹربیونل میں مقدمات چلائے جائیں گے۔ اس میں سپریم کورٹ کے جج شامل ہوں گے۔ جنگی قیدیوں کو اپنی پسند کے وکیل کرنے کی اجازت ہو گی اور وہ غیر ملکی قانون دانوں کی بھی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک دوسری خبر، ڈھاکہ کے اس سرکاری بیان میں بتائی ہوئی سہولتوں کی تردید کرتی ہے۔ اس خبر میں کہا گیا ہے کہ مصر، لبنان وینزویلا اور دیگر دوست ممالک نے مقدمات کی کارروائی میں

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

بقیہ : اداریہ

مقدمہ چلانا چاہتا ہے۔ انہیں رہا نہیں کیا جائیگا۔

اس سلسلے میں یہ خیال کرنا کہ بنگلہ دیش اور بھارت پاکستان کو خصوصی "رعایت" دے رہے ہیں۔ بالکل بے بنیاد ہے۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کو بھارت اور بنگلہ دیش زیادہ عرصے تک اپنے پاس نہیں رکھ سکتے آج پوری دنیا میں اس کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر ممالک نے محض اسی سبب بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا۔ گویا بھارت پر چاروں طرف سے دباؤ پڑ رہا ہے اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ جلد از جلد اس مسئلے کو نمٹا دے۔ اس طرح بھارت جنگی قیدیوں کو رہا کر کے پاکستان پر کوئی "احسان" نہیں کر رہا ہے۔ اسی طرح پاکستان میں مقیم بنگالیوں کے بدلے بہاریوں کی واپسی کی پیش کش بھی شیخ مجیب کے اپنے مفادات سے وابستہ ہے۔ وہ بہاریوں سے "عاجز" آچکے ہیں۔ اور اُن سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں تمام بہاری وطن فروش ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اس حد تک گر گئے تھے کہ انہوں نے بہاریوں کے لئے ایک جزیرہ مخصوص کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔

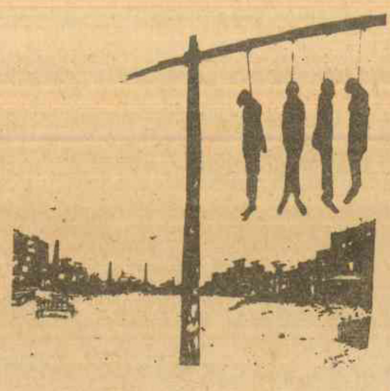
معلوم ہوتا ہے کہ بنگلہ دیش کی حکومت ہر قیمت پر ۱۹۵ پاکستانی جنگی قیدیوں پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ گویا "پرنالہ وہیں گرے گا"۔ یہ ہٹ دھرمی اس حد تک تجاوز کر چکی ہے کہ بنگلہ دیش نے اس مقدمے کے سلسلے میں مصر، لبنان اور وینزویلا کی طرف سے قانونی ماہرین بھیجنے کی پیش کش بھی مسترد کر دی ہے۔ اس سلسلے میں پاکستانی حکومت کا موقف بالکل واضح ہے، حق بجانب ہے۔ پاکستان کی طرف سے یہ موقف پیش کیا گیا ہے کہ چونکہ پاکستانی افواج اپنے ملک کے ایک حصے 'مشرقی پاکستان میں لڑ رہی تھیں' اس لئے ان پر مقدمہ چلانے کا حق صرف پاکستان کو ہے۔

صدر بھٹو نے دہلی اعلامیہ کے بعد بھارت کو بات چیت کی دعوت دی ہے اور یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ اگر بنگلہ دیش پاکستانی جنگی قیدیوں پر مقدمہ چلائے گا تو پاکستان بھی بنگالی افسروں پر مقدمہ چلائیگا۔ سنا گیا ہے کہ اندرا گاندھی اس سلسلے میں اپنے ایک خصوصی ایلچی کو پاکستان روانہ کر رہی ہیں۔ اگر اس بات چیت میں بھارتی حکومت نے لچکدار رویہ اختیار نہ کیا تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔

سب سے زیادہ قابلِ مذمت بات یہ ہے کہ پاکستان میں حزبِ اختلاف کے موقع پرست سیاستدان "بغض معاویہ" میں اپنی حکومت کو اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ جلد از جلد بنگلہ دیش اور بھارت کی اس "فراخدلانہ" پیشکش کو قبول کرے۔ اس سلسلے میں کراچی کے چند نام نہاد اور کج فہم دانشوروں کی طرف سے ایک اپیل شائع ہوئی ہے، جس کا اصل مقصد یہی ہے۔ اسی طرح سیاسی میدان کے ایک مزاحیہ اداکار اصغر خان بھی عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ بھارت اور بنگلہ دیش کی یہ پیش کش ان کی فراخدلی اور نیک نیتی کی آئینہ دار ہے۔ اصغر خان کی ہرزہ سرائیوں پر کون کان دھرتا ہے۔ یہ صاحب دیوانگی کی صورت کو پہنچ چکے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے، کل تک بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی بات کرتے تھے، آج اس سے انکاری ہیں۔ ہمارے یہ گھسے پٹے سیاست دان اب تک اپنے ذاتی اور جماعتی مفادات کو قومی مفادات پر قربان کر رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنی یہ روش تبدیل نہ کی تو اس بچے کھچے پاکستان کا مستقبل بھی غیر محفوظ ہو جائے گا۔

حزبِ اختلاف کو چاہیئے کہ وسیع تر قومی مفادات کے پیشِ نظر "مخالفت برائے مخالفت" کا رویہ ترک کریں، اور بھارتی توسیع پسندوں اور بڑے ممالک کی سازشوں کے خلاف اپنی حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کا مسئلہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو سیاسی جوڑ توڑ کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے۔ ہمارے سیاست دان برطانوی طرز کی جمہوریت کا راگ ضرور الاپتے ہیں۔ لیکن وہ اس نکتے کو ذہن میں نہیں رکھتے کہ اگر برطانیہ کو کوئی قومی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو پوری قوم فردِ واحد کی طرح متحد ہو جاتی ہے۔ ان خارش زدہ سیاست دانوں نے عوام کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب عوام کا شعور بہت آگے نکل چکا ہے۔ اگر انہوں نے اپنا یہ منفی رویہ ترک نہیں کیا تو وہ اپنے لئے اور زیادہ رسوائی کا سامان بہم کریں گے۔

سرورق کی کہانی



"تم ہمیں مار سکتے ہو، لیکن ہماری تحریک کو نہیں مار سکتے!"

احفاظ الرحمٰن

"بہادری سے آگے بڑھے چلو،
لڑائی شروع ہو چکی ہے۔

مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد بے روزگار ہے۔ سرمایہ داری کے خونی پنجے قانون اور بے جان امن کے کھوکھلے پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔

محنت کشو! تمہارا نعرہ اب یہ ہونا چاہیئے کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا! یکم مئی کی تاریخی اہمیت کو تو آنے والے زمانے میں تسلیم کیا جائے گا۔ یہ تمہارے حقوق طلب کرنے کا دن ہے۔ یہ بات اچھی طرح جان لو کہ سرمایہ دار بغیر لڑے، کام کے گھنٹے کبھی کم نہیں کریں گے!"

۸۷ سال پہلے ایک گمنام صحافی نے شکاگو کے ایک مزدور اخبار میں جو تاریخی جملے لکھے تھے، وہ آج تک اپنی پوری شدت کے ساتھ طبقاتی سماج کی سرزمینوں پر برق کی صورت گر رہے ہیں۔

یکم مئی ۱۸۸۶ء کو شکاگو کے جیالے مزدوروں نے سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف جو جہاد کیا تھا، آج دنیا بھر کے مزدور اور مزدور دوست اس کی یاد مناتے ہیں۔ شکاگو کی سڑکوں پر جو لہو بہا، اس کی مہک انہیں اپنے طبقاتی دشمنوں کے خلاف پوری نفرت کے ساتھ لڑنے پر ابھار رہی ہے۔

یکم مئی مزدوروں کے عظیم اتحاد اور ان کی ناقابلِ تسخیر قوت کی علامت بن چکا ہے۔ شکاگو کے مزدوروں نے ۸۷ سال پہلے جب اپنی تحریک کا آغاز کیا تھا، اس وقت سرمایہ داروں اور ان کے پالتو کتوں کو یہ گمان تک نہ ہوگا کہ یہ تحریک انکے نظام میں بہت بڑا شگاف ڈال دے گی۔ لیکن مزدوروں اور ان کے رہنماؤں کو اس کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ شکاگو کے شہیدوں نے تختۂ دار پر جس بہادری اور اعتماد کے ساتھ سرمایہ داروں اور ان کے پالتو کتوں کو مطعون کیا تھا، وہ ان کے ناقابلِ تسخیر جذبوں کا غماز ہے کہ جب یہ دن آتا ہے تو استحصالی نظام کے ہمنواؤں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے مزدور ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ان کے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک ہر شہر اور ہر قصبے کے مزدور، بلا امتیاز رنگ و نسل، یوم مئی کی عظیم جدوجہد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، اور اپنے اس عہد کی تجدید کرتے ہیں کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے کھنڈر پر ایک نئے، خوشحال اور منصفانہ معاشرے کی عمارت تعمیر کریں گے۔

یکم مئی کا واقعہ محنت کشوں کی ازلی و ابدی جدوجہد کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد برطانیہ کے کارخانوں میں مزدور جس کسمپرسی کے عالم میں کام کرتے تھے، اس کا علم سب کو ہے۔ بوڑھے، بچے اور عورتیں سولہ سولہ گھنٹے کام کرنے پر مجبور تھے۔ عمارتیں خستہ حال تھیں۔ تنگ و تاریک، گھٹے گھٹے ماحول میں کام کر کے ان کی روحوں پر زنگ لگ جاتا تھا۔ "جہاں تشدد ہوتا ہے، وہاں مزاحمت ضرور ہوتی ہے!" جب سرمایہ داروں کا ظلم بڑھنے لگا تو برطانیہ کے مزدوروں نے "آٹھ گھنٹے محنت، آٹھ گھنٹے روزمرہ کے مشاغل، آٹھ گھنٹے نیند!" کا نعرہ بلند کیا۔ دیکھتے دیکھتے پورا برطانیہ اس نعرے کی لپیٹ میں آ گیا۔ پارلیمنٹ میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ انسانیت دوست حلقوں نے اس جدوجہد میں مزدوروں کا پوری طرح ساتھ دیا۔ اور آخر انسانی اصولوں کو فتح حاصل ہوئی، اور ظلم کا سر ایک بار پھر نیچے جھک گیا۔

۱۸۵۶ء تک مزدوروں کا یہ مطالبہ بہت سے ممالک میں تسلیم کیا جا چکا تھا۔ لیکن امریکہ میں صورتِ حال اسکے برعکس تھی۔ خونی بھیڑیئے کام کے گھنٹے کم کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ وہ مزدوروں کا لہو نچوڑ کر اپنی تجوریاں بھر رہے تھے۔ اب وہ اپنا یہ نقصان کیسے برداشت کر سکتے تھے، کہ مزدور صرف آٹھ گھنٹے کام کریں اور سولہ گھنٹے "موج اڑائیں"۔

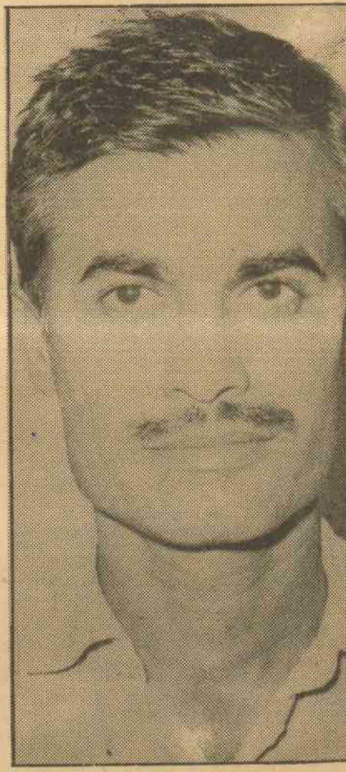
دنیا کی پہلی باقاعدہ ٹریڈ یونین ۱۸۲۷ء میں فلاڈیلفیا میں بن چکی تھی۔ اس کے بعد مزدوروں کو شدت سے اپنی اجتماعی قوت کا احساس ہوا اور رفتہ رفتہ بہت سے اداروں میں مزدوروں کی انجمنیں قائم ہو گئیں۔ اس کے بعد بھی مزدوروں کا اتحاد مکمل نہیں ہوا۔ مختلف ٹریڈ یونینوں میں رابطے کی کمی تھی۔ سب اپنی اپنی جگہ انفرادی طور پر کام کر رہے تھے۔

مزدور کا سب سے بڑا اتحادی کسان ہے

۲۰ اگست ۱۹۶۶ء کو امریکہ کی تمام مزدور تنظیموں کے نمائندے بالٹی مور کے مقام پر جمع ہوئے اور انہوں نے "نیشنل لیبر یونین" کی بنیاد ڈالی۔ نیشنل لیبر یونین کے اجلاس میں مزدوروں کے نمائندوں نے متفقہ طور پر ایک قرار داد منظور کی، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ امریکہ کی تمام ریاستوں میں مزدوروں سے صرف آٹھ گھنٹے کام لیا جائے۔ اس کے بعد مزدوروں کے نمائندوں نے اپنے اپنے اداروں میں واپس جاکر مزدوروں کو اور زیادہ تیزی کے ساتھ منظم کرنا شروع کیا۔

اسی سال ستمبر میں مزدوروں کی بین الاقوامی تنظیم، جینوا کانگریس نے مزدوروں کے اس مطالبے کی تائید کی کہ ان سے آٹھ گھنٹے کام لیا جائے۔

۱۸۶۷ء میں عظیم مفکر کارل مارکس نے اپنی کتاب "سرمایہ" میں پرولتاریہ کی عظیم قوتوں کو خراجِ تحسین پیش



عثمان بلوچ

کرتے ہوئے اس کے اس مطالبے کی پُر زور الفاظ میں تائید کی۔ ۱۸۷۵ء میں مزدور کارکنوں کی بڑھتی ہوئی اجتماعی قوت اور ان کی متحدہ انجمن سے خائف ہو کر سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں نے اس انجمن کے دس سرگرم کارکنوں کو پھانسی دے دی۔

۱۸۷۷ء میں مزدوروں کے اس مطالبے نے ایک بھرپور ملک گیر تحریک کا روپ دھار لیا۔ سرمایہ داروں اور انکے ایجنٹوں کے تمام ہتھکنڈے ناکام ہوئے اور ہر مزدور کی زبان پر یہ نعرہ گونجنے لگا۔ "ہم صرف آٹھ گھنٹے کام کریں گے!"

۸۵-۱۸۸۴ء میں امریکہ کو ایک زبردست معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ ہزاروں مزدور بیروزگار ہو گئے مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ ان حالات میں مزدور تحریک کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ "جن لوگوں کے اوپر صرف آسمان اور نیچے صرف زمین ہوتی ہے، ان کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں ہوتا!" ایک طوفان آیا، اور سرمایہ داروں اور ان کے پالتو کتوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

یکم مئی کا سورج طلوع ہوا تو اس کے ماتھے پر مزدوروں کا جاہ و جلال ٹپک رہا تھا۔ مشینوں کے پہیئے بے جان ہو گئے۔ سرمایہ داروں کے دلوں کی دھڑکنیں بند ہو گئیں۔ تمام کارخانوں کے مزدوروں نے اپنے مطالبے "آٹھ گھنٹے محنت، آٹھ گھنٹے روزمرہ کے مشاغل اور آٹھ گھنٹے نیند!" کی تکمیل کرانے کے لئے ہڑتال کر دی۔

۳۰ مئی کو شکاگو میں میکاوس ہیمر ورکس کے پُر امن ہڑتالیوں پر پولیس نے حملہ کر دیا۔ مزدوروں نے بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا۔ اس حملے میں پانچ مزدور شہید اور متعدد زخمی ہوئے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ مزدوروں میں استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نفرت اور شدید ہو گئی۔

اگلے دن راندالف کی ہے مارکیٹ میں محنت کشوں نے ایک احتجاجی جلسہ منعقد کیا۔ جلسے میں یہ اعلان کیا گیا کہ جب تک ان کے مطالبات تسلیم نہیں کئے جائیں گے، اس وقت تک ہڑتال جاری رہے گی۔ مزدوروں کی طرف سے کوئی اشتعال انگیزی نہیں ہوئی۔ وہ جلسے کے بعد پُر امن طور پر منتشر ہو رہے تھے کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سرمایہ داروں کے ایک پالتو غنڈے نے ہجوم پر ایک دستی بم پھینک دیا۔ ایک پولیس سارجنٹ ہلاک ہو گیا۔ اس کا بہانہ لیکر پولیس نے مزدوروں پر حملہ کر دیا۔ مزدوروں اور پولیس کے درمیان دوبدو لڑائی ہوئی۔ آدھے گھنٹے کی لڑائی میں چار مزدور شہید اور سات سپاہی ہلاک ہوئے۔ اس کے علاوہ متعدد افراد زخمی ہوئے۔ مزدوروں نے اپنے شہید ساتھیوں کے لہو سے ایک پرچم رنگ لیا، اور اسے لے کر اگلے دن پھر جلوس نکالا۔ شکاگو کے گلی کوچوں میں مزدوروں کا راج قائم ہو گیا۔

اب یہ تحریک کسی کے روکے نہیں رُک سکتی تھی سرمایہ داروں اور ان کے پالتو کتوں نے اپنا آخری کارڈ بھی استعمال کر لیا۔ انہوں نے مزدوروں کے رہنماؤں فشر، رابرٹ، اینجل، سپائنز اور پیر سنز کو گرفتار کر کے انہیں موت کی سزا سنا دی۔

ظالم بھیڑیوں نے ان جیالوں کو پھانسی دے دی، لیکن ان شہیدوں نے تختۂ دار پر جس جرأت کے ساتھ موت کا مقابلہ کیا، اور استحصالی بھیڑیوں کو مخاطب کرتے ہوئے جو جملے کہے، وہ محنت کشوں کی تاریخ میں آج تک جگمگا رہے ہیں اور حریت پسند انسانوں کا لہو گرما رہے ہیں۔

تختۂ دار پر فشر نے کہا ——— "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم ایک اچھے کام کے لئے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں!"

رابرٹ نے کہا ——— "تم اس آواز کا گلا گھونٹ سکتے ہو، لیکن وقت آئے گا جب ہماری خاموشی تمہاری آواز سے بھی زیادہ زوردار ہو گی!"

اینجل نے کہا ——— "تم ہمیں مار سکتے ہو، لیکن ہماری تحریک کو نہیں مار سکتے۔ ہماری تحریک تمہاری موت کا پیغام بن کر ابھری ہے!"

بوڑھے سپائینز نے کہا ——— "سرمایہ دارو! کیا مجھے بھی بولنے کی اجازت ہے؟ حاکمو! غریب انسانوں کی آواز بلند ہونے دو۔ ورنہ پھر ان کی تلواریں بلند ہوں گی۔ ان اٹھی تلواروں کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں جھکا سکتی۔"

ظالم بھیڑیوں نے ان جیالے مزدوروں کو شہید کر دیا، لیکن وہ ان کے لمحہ لمحہ پھیلتے جذبوں کو نہ کچل سکے۔ یکم مئی کا واقعہ مزدوروں کے دل پر نقش ہو گیا۔ انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ جنگ ختم نہیں ہوئی۔ جنگ ختم بھی کیسے ہو سکتی تھی۔ یہ تو وہ جنگ ہے جو دو طبقوں کے درمیان ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ اس وقت تک جاری رہے گی، جب تک کہ ایک غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں نہیں آئے گا۔

دنیا بھر کے مزدور یکم مئی کو اپنے ان عظیم شہیدوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں، جنہوں نے اپنے لہو سے ان کے لئے جدوجہد کی راہ روشن کی تھی۔

آج یکم مئی کے واقعے کو ۸۷ سال گزر چکے ہیں۔ مزدوروں کی جدوجہد بہت آگے نکل چکی ہے بعض ممالک میں پرولتاریہ کا راج قائم ہو چکا ہے۔ لیکن جو ممالک اب تک سرمایہ دارانہ نظام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، وہاں

جاگیرداری سرمایہ داری کا کُتّا اب تک کنویں سے باہر نہیں نکلا

سرمایہ داروں کی فرعونیت اور رعونیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ مزدوروں کی جدوجہد کو نئے نئے ہتھکنڈوں سے ناکام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں خالص معاشی جدوجہد کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ محنت کش طبقے کی جدوجہد کا اصل مقصد پرولتاریہ کی آمریت قائم کرنا ہے۔
یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ جس ملک کے جیسالے



یاور خان



اقبال نیازی



خان محمد نثار

مزدوروں نے یکم مئی کو اپنے لہو سے استحصالی نظام کے مکروہ چہرے کو داغدار کیا تھا، وہ آج سرمایہ دارانہ نظام کو برقرار رکھنے کے لئے مختلف ممالک کی بورژوا حکومتوں کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ اسی لئے دنیا بھر کے ممالک، جب سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف لڑتے ہیں تو وہ امریکی سامراج پر بھی ضرب لگاتے ہیں۔

یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ جس ملک میں پہلی بار ایک سوشلسٹ معاشرہ قائم ہوا، اس کے موقعہ پرست سیاستدان اپنے عوام کو پیچھے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دنیا کے چھوٹے ممالک پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی لئے دنیا بھر کے عوام دوست حلقے جب اپنے طبقاتی دشمنوں کے خلاف جدوجہد کا پرچم بلند کرتے ہیں تو وہ سوشل سامراجیوں کو بھی بے نقاب کرتے ہیں جو پرولتاریہ کے نام پر پرولتاریہ کے مفادات کو قربان کر رہے ہیں۔

پاکستان کے مزدور بھی اس وقت اسی قسم کی صورتحال سے دوچار ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے اپنے طبقاتی دشمنوں کے خلاف مردانہ وار جدوجہد کر رہے ہیں۔ اب ہمارے مزدور چھوٹے چھوٹے معاشی مسائل کی حدود سے باہر نکل چکے ہیں۔ اب انہیں اس بات کا پورا احساس ہو چکا ہے کہ جب تک ریاست پر ان کی آمریت قائم نہیں ہو گی، اس وقت تک ملک کے تمام محنت کش اپنے حقوق سے محروم رہیں گے، اور زندگی یونہی سربازار رسوا ہوتی رہے گی۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ سامراج اور سوشل سامراج کے خلاف لڑائی ان کی عظیم جنگ کا حصہ ہے۔ وہ اندرونِ ملک اپنے طبقاتی دشمنوں، سرمایہ داروں اور ان کی پروردہ نوکرشاہی کے خلاف لڑ رہے ہیں اور دوسرے ممالک کے عوام کی منصفانہ جدوجہد کی حمایت کر رہے ہیں۔

ایوب خانی عہد میں مزدوروں کی تحریک نے ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک پر بدترین فسطائیت کا تسلط قائم تھا۔ موقع پرست سیاست دان، فوجی افسران، نوکرشاہی، سرمایہ دار اور جاگیردار ایک دوسرے گٹھ جوڑ کرکے عوام کا لہو نچوڑ رہے تھے۔ ہر "باغی" اور "سرکش" کے لئے عقوبت کے دروازے بڑی "فیاضی" کے ساتھ کھلے ہوئے تھے۔ جب ایوب خاں کی فسطائیت کے خلاف پیپلز پارٹی نے جدوجہد شروع کی تو عوام کے دوسرے حلقوں کے ساتھ مزدوروں نے بھی کھل کر اس کی حمایت کی۔ اس کی وجہ صرف



عزیز الحسن

یہ نہیں تھی کہ پیپلز پارٹی ایوب آمریت کے خلاف جدوجہد کر رہی تھی۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ پیپلز پارٹی نے اپنا منشور سوشلزم کی بنیاد پر بنایا تھا۔ پیپلز پارٹی کی حمایت کے جرم میں بہت سے مزدور کارکنوں کو روزگار سے محروم کر دیا گیا۔ لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوتے، اور وہ بھرپور انداز میں پیپلز پارٹی کے منشور کی حمایت کرتے رہے۔ ایوب خان کے دور میں مزدوروں پر جو تشدد ہوا، اس نے ان کی تحریک کو اور تیزی سے آگے بڑھایا۔ ایوب خانی حکومت کے عوام دشمن رویے نے اس کو چاروں شانے چت کر دیا۔

ایوب خان، یحییٰ خان کو اپنی جگہ دیکر رخصت ہو گئے۔ یحییٰ خان کے دور میں جمہوری تحریک کے لئے سب سے نمایاں کردار مزدوروں نے ادا کیا۔ اس وقت تک وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ وہ نوکرشاہی کے ذریعے اپنے جائز حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اجتماعی قوت کے ذریعے سرمایہ داروں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ "گھراؤ" تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ سرمایہ داروں کے حلقے میں کہرام مچ گیا۔ نوکرشاہی بھی اس کی مدد نہ کر سکی۔ مزدور کارخانوں کے مالکان کا "گھراؤ" کرتے اور انہیں اپنے حقوق تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتے۔ کراچی سے لیکر سوات تک، تمام مزدور ایک یکساں طبقاتی احساس کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ اس جدوجہد کے باعث مزدوروں کو اپنی قوت کا احساس ہوا، اور سرمایہ داروں کو بھی یہ احساس ہونے لگا کہ اگر وہ کسی حد تک مراعات نہیں دیں گے تو ایک بہت بڑا طوفان اُٹھ کھڑا ہو گا۔

اس احساس کے ساتھ سرمایہ داروں اور انکے حلیفوں، جاگیرداروں، سرکاری افسران اور گھسے پٹے سیاست دانوں نے پیپلز پارٹی پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے سرگرم کارکنوں کو جو نچلے اور متوسط طبقوں سے تعلق رکھتے تھے، پیچھے دھکیل دیا، اور تمام کرسیاں اپنے قبضے میں کر لیں۔ اب وہ اس پوزیشن میں آ گئے کہ پیپلز پارٹی کے منشور کو توڑ مروڑ کر اپنے مفادات کے آئینے میں ڈھال سکیں۔

مزدور، سرمایہ داروں کی اس سازش کو بھانپ گئے۔

پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو اس کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وعدے ہوا میں بکھر چکے تھے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو تمام موقع پرست سیاست دان اور جاگیردار اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھے اپنی اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے۔ کراچی، لائلپور، ملتان اور راولپنڈی کے مزدوروں نے اپنی تحریک کو اپنے بل پر آگے بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ کراچی کے مزدوروں کی جون تحریک اس نئے موڑ کی پہلی منزل تھی۔ نوکر شاہی نے کھل کر سرمایہ داروں کے مفادات کی حمایت کی، اور مزدوروں کے سینے چھلنی کر دیئے۔ جو لوگ اب بھی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے، ان کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ لاتعداد مزدوروں اور ان کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ڈی۔ پی۔ آر کی تلوار ہر حق پسند کے سر پر لہرانے لگی۔ مزدوروں کی جون تحریک نے ان کو نئے تجربات دیئے اور ان میں لڑنے کا نیا حوصلہ پیدا کیا۔

اس کے بعد گزشتہ سال کی دوسری ششماہی میں نوکر شاہی نے مزدوروں کے خلاف اپنے نئے حملے کا آغاز کیا۔ لائلپور، ملتان، گدو بیراج اور ڈہرکی میں یکے بعد دیگرے مزدوروں کے خلاف انتہائی بہیمانہ تشدد کا عمل شروع ہوا۔ لیکن جب اکتوبر کے مہینے میں، کراچی کی باری آئی تو یہاں کے جیالے مزدوروں نے اپنی بھرپور قوت اور انقلابی رجائیت کے ساتھ سرمایہ داروں اور ان کی پروردہ نوکر شاہی کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ کیا۔ مزدوروں کا اتحاد ناقابلِ تسخیر تھا۔ نوکر شاہی اور سرمایہ داروں نے اپنے زر خرید ایجنٹوں کے ذریعہ مزدوروں میں انتشار پھیلانے کی کوشش کی، لیکن انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پولیس ان کے آگے بے بس نظر آنے لگی تو حکومت نے نہتے مزدوروں کو کچلنے کے لئے فوج کو طلب کر لیا، جس کا اصل کام سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ اس صورتِ حال میں مزدور اپنی محدود طاقت کے پیشِ نظر وقتی طور پر تدبیری پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

پیپلز پارٹی کے مختصر سے دورِ حکومت میں مزدوروں پر جو بہیمانہ تشدد ہوا، اس کی مثال نہیں ملتی۔ مزدور دوستی کی دعویدار حکومت نے کراچی سے سوات تک سینکڑوں مزدوروں کو شہید کیا، اور ہزاروں مزدوروں اور ان کے رہنماؤں کو جیلوں میں بند کر دیا۔ سرمایہ دار، جاگیردار اور موقع پرست سیاست دان اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے، اور اب وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی بنائی ہوئی پالیسیوں پر عمل کر رہے تھے۔ مزدور تحریک کو کچلنے کے لئے مزدوروں اور ان کے رہنماؤں کے خلاف انتہائی "فیاضی"

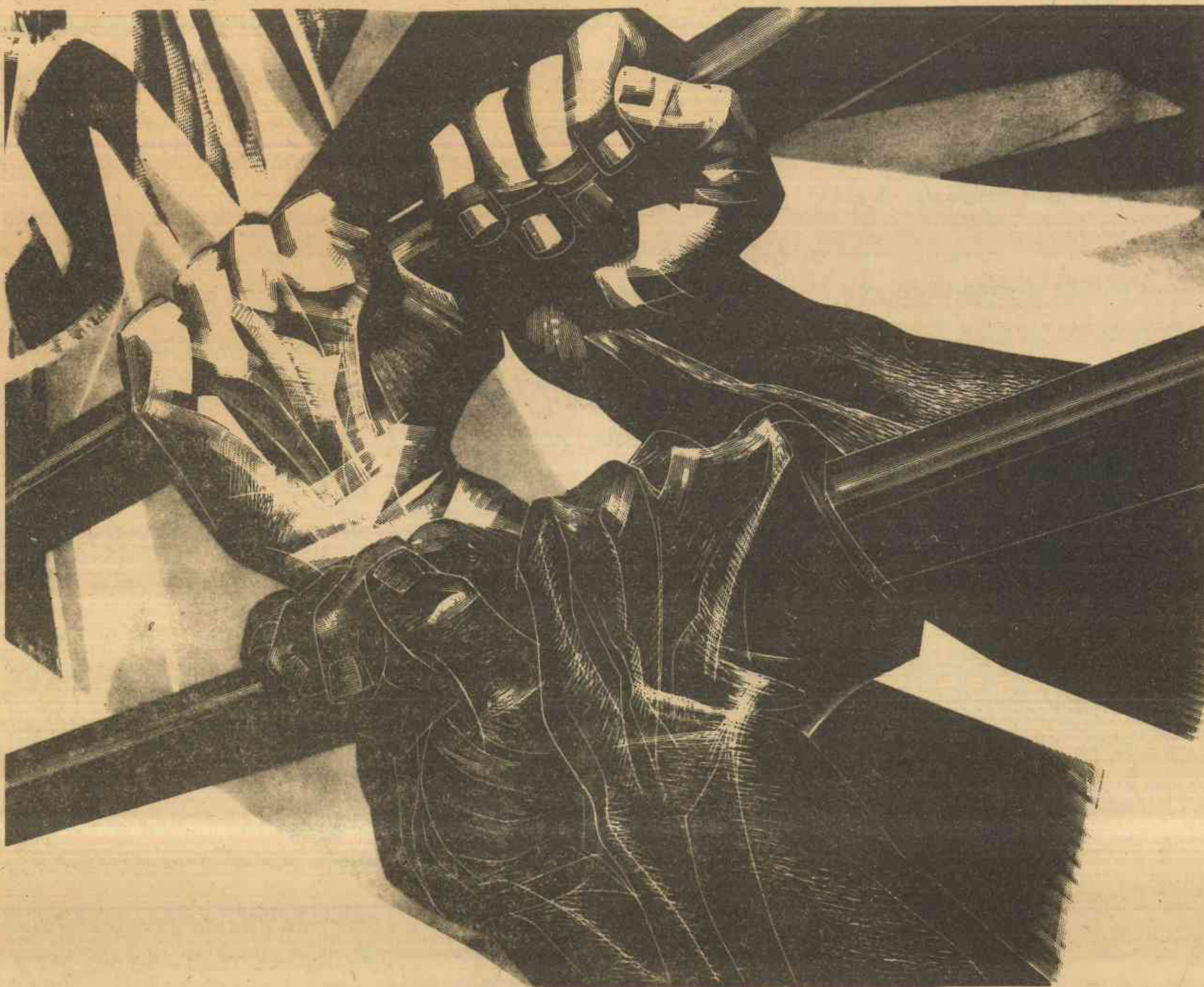
باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمایئے

اعجاز گل

مصلحتوں کی گرہیں

کشمکش کے لبادے میں لپٹے بدن نامرادی کی دہلیز پر منجمد ہیں
صعوبت زدہ راستے —— بے مسافر ہیں
اور رات کی دسترس رات تک ہے
خلا میں معلّق نگاہوں پہ دہشت کی چمگادڑیں ٹوٹتی ہیں
ارادوں کی دھندلی لکیریں غنیم آگ کی زد میں ہیں
بستیاں —— روشنیوں کی سرحد پہ مصلوب ہیں
مرثیے کی اجازت نہیں
جب زمیں سرکشی کی اذیت سہے گی
یہ مصلحتوں کی گرہیں کھلیں گی
لہو —— وقت کی شاہراہوں پہ اُچھلے گا
اور منتقم ہاتھ لہرائیں گے
ہڈیاں کڑکڑانے سے ہفت آسماں بانجھ ہو جائیں گے
میں قصیدہ لکھوں گا

دُنیا بھر کے مزدُورو ۔۔ ایک ہو جاؤ



شکاگو کے شہیدوں کا سُرخ پرچم پُوری دنیا پر لہرا رہا ہے

ظفر زیدی

یکم مئی ساری دنیا کے محنت کشوں کا دن ہے ۔ مئی ۱۸۸۶ء میں امریکہ کے سب سے بڑے صنعتی مرکز شکاگو میں سرمایہ داروں کی حکومت نے مزدوروں کا قتلِ عام کیا تھا۔ انیسویں صدی میں مزدوروں سے روزانہ انیس بیس گھنٹے کام لیا جاتا تھا اور پیسے اتنے بھی نہ دیئے جاتے کہ وہ اور اُن کے بال بچے دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھالیں۔ امریکی سرمایہ داروں نے کارخانوں کو بیگار کیمپ بنا رکھا تھا۔ سورج نکلنے سے پہلے مزدوروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ان کارخانوں میں دھکیل دیا جاتا اور اُن سے انیس بیس گھنٹے آدھی رات گئے تک سخت محنت لی جاتی۔ لوہے کے دروازوں پر بڑے بڑے تالے ڈال دیئے جاتے فیکٹری کے کسی حصے میں آگ بھڑک اٹھتی تو کئی مزدور جل کر راکھ ہو جاتے۔ سرمایہ دار کہتے " کام کے دوران حادثات عین ممکن ہیں ۔ مزدور کام کے لئے ہوتے ہیں ۔ اور مزدوری کرتے ہوئے مر کھپ جانا کام کا ایک حصہ ہے "۔ صنعتی محنت کشوں کی حالت بہت ہی خراب تھی ۔ تفریح کا تو سوال ہی کیا آرام تک کے لئے وقت نہ دیا جاتا۔ تنخواہ صرف اتنی دی جاتی کہ وہ صرف زندہ رہ سکیں تاکہ سرمایہ داروں کی فیکٹریاں چلتی رہیں ۔ دراصل لوہے کوئلے اور تیل کی طرح مزدور کی زندگی گوشت پوست اور مزدور کی

شہیدوں کی روحوں کا ہے استغاثہ - سزا دو! سزا دو

رگوں میں دوڑتا ہوا خون سب سرمایہ دار کیلئے خام مال کی حیثیت رکھتا ہے جو سکہ اور زرِ مبادلہ میں ڈھل کر سرمایہ دار کی اجارہ داری بنائے رکھتا ہے۔ اور پھر حکومت اور قانون اُس کے اپنے ہوتے ہیں ۔۔۔۔ تو اُن دنوں قانون تھا کہ مزدور انیس بیس گھنٹے کام کرے گا۔

مئی ۱۸۸۶ء سے پہلے یورپ اور روس کے محنت کشوں نے دس گھنٹے کام، اور آٹھ گھنٹہ کام، کی تحریک چلائی ہوئی تھی۔ سرمایہ دار حکومتوں نے اس تحریک کو خلافِ قانون کہہ کر ہر جگہ کچلنے کا پکا بندوبست کر رکھا تھا۔ ابھی دنیا بھر کے محنت کش ایک نہیں ہوئے تھے۔ لیکن دنیا بھر کی سرمایہ دار جاگیر دار حکومتیں مزدوروں کو کچلنے کے لئے متحد ہو چکی تھیں۔ اور وہ مزدوروں کی ہر جائز جدوجہد کو خلافِ ضابطہ قرار دے کر ہمیشہ کے لئے دبانے کے درپے تھیں وہ ہل چلانے والے بیلوں کی طرح مزدوروں کو مشینیں چلانیوالے ترقی یافتہ جانور سمجھتی تھیں۔ اور ہمیشہ بیگار کیمپ نما، فیکٹریوں میں کام کرنے والے غلام بنائے رکھنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ انیسویں صدی کے نصف میں زارِ روس نے روسی مزدوروں کا قتلِ عام کیا۔ انگلستان آسٹریلیا، فرانس اور امریکہ کی مختلف ریاستوں میں مزدوروں کی "آٹھ گھنٹہ کام" تحریک کو پوری طاقت اور بے دردی سے کچلا گیا۔ لیکن سرمایہ دار چونکہ سرمایہ کی چکا چوند فرعونیت تلے جنم جنم سے اندھا چلا آرہا ہے اس لئے وہ ان تاریخی فیصلوں کو نہیں پڑھ سکتا جو محنت کشوں کی تحریکیں مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں محنت کشوں کے پُرعزم گرم گرم لہو سے سینۂ گیتی پر رقم کرتی چلی آرہی ہیں۔

یکم مئی ۱۸۸۶ء کو امریکہ کے صنعتی شہر شکاگو کی فضا خلافِ معمول کثافت سے پاک تھی اور فضا میں گرد و غبار اور دھواں نام کو نہ تھا۔ فیکٹریاں اور کارخانے بند تھے۔ آج تمام گورے اور کالے مزدور رنگ و نسل کا فرسودہ تصور چھوڑ کر مزدور برادری میں شامل ہو چکے تھے۔ تمام مزدوروں کے چہرے مزدور تحریک کی ذمہ داریوں اور جوش و جذبہ سے تمتمائے ہوئے تھے۔ آج انہیں پوری طرح احساس تھا کہ وہ ساری دنیا کے مزدوروں کی بھلائی کے لئے ایک پُرعزم انقلابی جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں۔ اُنہیں یہ بھی معلوم تھا کہ سرمایہ دار بھیڑیوں اور درندوں کا روپ دھار چکے ہیں وہ محنت کشوں کو اپنے حقوق کے لئے آمادۂ جدوجہد دیکھ کر آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ لیکن انقلابیوں کے اُٹھے ہوئے قدم پیچھے نہیں ہٹتے قربانیاں خواہ کتنی ہی کیوں نہ دینی پڑیں فتح بالآخر محنت کشوں کی ہوگی ۔۔۔۔ کہ یہ صنعتی دور کی تاریخ کا فیصلہ ہے۔ انیس بیس گھنٹہ کی جبری مشقت کے خلاف شکاگو میں عظیم الشان پُرجوش مظاہرے ہوئے۔ کچلے ہوئے محنت کش عوام غلام داری، سرمایہ داری اور استحصال کے خلاف گلی کوچوں سے نکل کر شاہراہوں پر امنڈ پڑے وہ چیخ چیخ کر سرمایہ داروں کے انیس بیس گھنٹے کام کے قانون کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے: "اوقاتِ کار میں کمی کر دو"، "اتنی اُجرت دو کہ زندہ رہ سکیں"، "تنظیم اور یونین سازی کا حق دو۔ ظالمانہ سرمایہ داری جاگیرداری نظام مُردہ باد۔ اور دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ"۔ زبردست پُرجوش مظاہرے جاری رہے۔ تین مئی کو سرمایہ داروں کے قانون کی طابع پولیس نے ہڑتالی مزدوروں پر فائر کھول دیا۔ چھ مزدور موقع پر شہید ہو گئے اور سینکڑوں خاک و خون میں لت پت زمین پر تڑپنے لگے۔ شکاگو کی سڑکیں مظلوم لیکن جیالے مزدوروں کے انقلابی لہو سے سُرخ ہو گئیں۔ چار مئی کو شکاگو کے بڑے چوک میں گذشتہ روز کے قتلِ عام کے خلاف زبردست احتجاجی مظاہرہ ہوا۔ سرمایہ داروں کی حکومت نے حسبِ دستور پھر قتلِ عام کرایا۔ بم پھینکا گیا۔ مزدور ظالمانہ نظام سے تنگ آ چکے تھے۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ جم کے لڑے اس روز سات پولیس مین اور کافی مزدور ہلاک ہو گئے۔ ہزاروں زخمی ہوئے۔ سڑکوں پر چاروں طرف خون ہی خون نظر آتا تھا۔ مزدور ظلم سے دیوانہ وار ٹکرائے۔ بہت سے مزدوروں نے اپنی قمیضیں پھاڑ کر اپنے تڑپتے ہوئے مزدور ساتھیوں کے سُرخ خون سے رنگ لیں۔ اور ان خون آلود قمیضوں کے انہوں نے سرخ پرچم بنالئے۔ یہ سُرخ پرچم آج تک محنت کشوں کی جدوجہد کا علامتی نشان بنا ہوا ہے۔ مزدوروں کے قتلِ عام پر ہی ظلم کی انتہا نہیں ہوئی بلکہ سرمایہ داروں کی حکومت نے مزدوروں کے لئے تن من دھن قربان کر دینے والے مزدور لیڈروں کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ مزدور لیڈر فشر، سپارٹیز، اینگل اور پارسنز کو جب پھانسی کے تختہ پر لایا گیا تو وہ ویسے ہی پُرعزم اور پُراعتماد نظر آرہے تھے جیسے کہ مظاہروں کے دوران تھے۔ اُنہوں نے تختۂ پھانسی پر بھی مختصر تقریریں کیں اور سرمایہ داروں کو ڈانٹ کر کہا کہ استحصالی طبقہ کا انجام بہت بھیانک ہو گا۔ اور فتح بالآخر محنت کش طبقہ کی ہو گی۔ اور آج دنیا بھر میں کسان مزدور تحریکوں اور انقلابیوں کی پے بعد دیگرے کامیابیوں سے پتہ چلتا ہے کہ ظلم کی پھانسی پر چڑھے ہوئے ان بہادر انسانوں نے کس قدر سچ کہا تھا۔ شکاگو کے قتلِ عام کے خلاف سارے امریکہ اور یورپ میں محنت کش طبقہ قابو سے باہر ہو گیا اور زبردست احتجاج ہوئے۔

شہیدوں کی روحوں کا ہے استغاثہ سزا دو! - - سزا دو!!
یہی عدل و انصاف کا ہے تقاضہ سزا دو! - - سزا دو!!
جنہوں نے بہایا لہو اس زمیں پر، اسی چوک میں ان درندوں کو لاکر
سزا دو! - - - سزا دو!!
ہوا کس کے ایما سے یہ جرم آخر، کیا قتل کا حکم تھا جس نے صادر
اسے بھی اسی چوک میں آج لاکر، سزا دو! - - سزا دو!
شہیدوں کی روحوں کا ہے استغاثہ سزا دو! - - سزا دو!

(پبلو نرودا ——— چلّی)

یومِ مئی شکاگو میں مزدوروں کے قتلِ عام کا کوئی ایک سوگوار دن نہیں ہے۔ اور نہ ہم محنت کشوں کے پاس اتنا وقت ہے کہ ہم آنسو بہانے اور غم منانے کے لئے کچھ دیر ٹھہریں۔ یومِ مئی ایک تحریک ہے ظلم و استبداد اور استحصال کے خلاف محنت کش عوام کی ایک عظیم تحریک، جو صدیوں سے اسی جوش و ولولے کے ساتھ چلتی رہی جس کا مظاہرہ مئی ۱۸۸۶ء کے جیالے مزدوروں نے اپنے انقلابی خون کا نذرانہ پیش کر کے کیا تھا۔ ظلم و استحصال کے خلاف اس تحریک کو دنیا بھر کے محنت کشوں نے اپنے انقلابی خون سے سینچا ہے۔ کبھی روس کے زاروں نے محنت کشوں کا بے دریغ قتلِ عام کیا۔ کبھی فرانس کے جاگیرداروں نے کسانوں اور مزدوروں کے خون سے ہولی کھیلی۔ کبھی برطانیہ کے لارڈ اور وائسرائے نے ہندوستان اور دیگر نوآبادیوں کے مفلوک الحال عوام کو اپنے بہیمانہ ظلم کا شکار بنایا۔ کبھی امریکی سامراج نے کوریا اور ویٹ نام کی بہادر غریب اقوام کو ہولناک ہتھیاروں کا سہارا لے کر آگ اور خون میں نہلایا۔ محنت کشوں کے حقوق کی اس تحریک میں کبھی کراچی کی سڑکوں کو مزدوروں کے لہو سے تر بتر کیا گیا، کبھی احمد آباد، کانپور، بمبئی کبھی شکاگو، واشنگٹن، نیویارک کبھی لندن، پیرس، بون اور کبھی ٹوکیو، ہانگ کانگ جکارتہ میں ایک جیسی سرمایہ دار جاگیردار حکومتوں نے محنت کشوں کو استحصال کی مکروہ دیوی کی چتا پر بھینٹ چڑھایا۔

لیکن محنت کشوں کی تحریک ظلم سہہ سہہ کر قربانیاں دے دے کر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ اب دنیا بھر کے محنت کشوں کی تحریک اس قدر مضبوط ہے کہ دنیا کی کوئی

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں

احسن اعجاز

یومِ مئی

دنیا کے سرمایہ دارو
ظلم و تشدد کے عفریتو !
ہم نے اپنے قاتل کو پہچان لیا ہے
وحشی قاتل !
جس کے جبڑے مزدوروں کے خون سے تر ہیں۔
جس نے ہماری محنت چھینی
ذہنوں کے زنداں میں جس نے
سوچوں کو محبوس کیا ہے
جس نے ہمارا خون بہایا
جس نے تختۂ دار سجایا
آج وہ قاتل خوف زدہ ہے
لیکن اپنی تلواروں سے
اب اس کا بچنا مشکل ہے

یومِ مئی کے عظیم شہیدو
سرخ قیادت کے سائے ہیں
ظلم کے آگے سینہ سپر ہیں
مر کر بھی ہم لوگ امر ہیں
ہر سُو تختۂ دار سجے ہیں
ہم دیوانہ دار کھڑے ہیں
خون بہانا رسم ہے اپنی
دار پہ چڑھنا ریت ہماری
جب تک یوں ہی خون بہے گا
خون میں اپنے پرچم رنگ کر
سرخ پھریروں کے سائے میں
ظلم و استبداد سے اپنی
جبر سے اپنی
جنگ رہے گی ـــــ جنگ رہے گی

شہر شگاگو کے مزدورو
یومِ مئی کے عظیم شہیدو
تختۂ دار پہ حق کی خاطر مرنے والو
تم نے اپنا خون بہا کر
تم نے اپنی جان گنوا کر
مزدوروں کو
دہقانوں کو
مظلوموں کو
اپنے حق کی خاطر مرنا
ہنستے ہنستے دار پہ چڑھنا
سکھلایا ہے
مزدوروں کی تحریکوں کو
تم نے اپنے خون سے سینچا

بھارت کو ۸ کروڑ ۶۷ لاکھ ڈالر کی امریکی امداد

امریکہ پاکستان کو مہلک ہتھیار نہیں دے گا

محمد میاں

پاکستان میں امریکی ذرائع نے حال ہی میں اعلان کیا تھا کہ گزشتہ ایک سال کے عرصہ میں امریکہ نے پاکستان کو ۴۰ کروڑ ۳۰ لاکھ ڈالر کی امداد دی ہے، جو ۱۹۶۵ء سے آج تک کسی سال میں امریکہ سے پاکستان کو ملنے والی امداد سے زیادہ رقم ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ پاکستان کے لئے امریکی اسلحہ کی امداد کی خبریں بھی آتی رہتی ہیں۔

ایک اور سنسنی خیز خبر امریکی ذرائع سے چھپی ہے کہ پاکستان میں امریکی تحویل میں ۴۱ ارب روپے موجود ہیں۔ امریکی یہاں سستی مزدوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے صنعتیں لگانے کے لئے کوشاں ہیں۔ انہوں نے بلوچستان میں تیل نکالنے کا بھی ٹھیکہ لیا ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ ننھے پاکستان کی حمایت میں چچا سام داڑھی لہراتے چلے آرہے ہیں۔ آج کل پاکستان میں امریکی اثر اسکندر مرزا کے عہد کی سطح پر پہنچ چکا ہے۔

مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دراصل امریکہ بھی ایک متبادل منصوبہ پر کوئی بیس سال سے کام کر رہا ہے، جس کا مدعا یہ ہے کہ بھارت کو اقتصادی اور صنعتی لحاظ سے چین و روس کا ہم پلہ بنائے اور وہاں کی بنیا شاہی کی مدد سے بحرِ عرب و ہند کے منطقے پر اپنا اثر باقی رکھے۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ بھی پاکستان کو دریائے سندھ کے مشرقی اور مغربی کنارے کی بنیاد پر بانٹ کر مشرقی حصہ بھارت اور مغربی حصہ ایران و افغانستان کے حوالے کرنے کی سوچ رہا ہے، جبکہ دائیں بازو کے دلال آج کل بڑے زور شور سے امریکہ کی آمد آمد کے گیت گاتے ہیں اور اس سانحہ کو بقائے پاکستان سے لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔

اس بارے میں امریکی مجلہ ٹائم نے ایک نقشہ بھی شائع کیا تھا۔ جس میں پاکستان کی قومیتوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔

اب حال میں امریکی جریدہ نیوز ویک نے دہلی میں نئے امریکی سفیر ڈینیل پیٹرک موائے نیہان کا بیان شائع کیا ہے جس میں امریکہ کی بھارت کے بارے میں جدید سیاست عملی کی تشریح کی گئی ہے۔ جریدے کے مطابق امریکی سفیر نے اپنی آمد کے چھ ہفتوں کے دوران اپنے میزبانوں کو یقین دہانی کرائی ہے کہ امریکہ اپنی مائل بہ پاکستان سیاست کو تبدیل کر رہا ہے اور ایک جدید "حقیقت پسند" برصغیر کا تصور اختیار کر رہا ہے۔

"اس نئی سیاست عملی کی بنیاد یہ ہے کہ بھارت کو اس حیثیت سے تسلیم کیا جائے جو اس کو حاصل ہے۔ یعنی اس منطقہ کی عظیم ترین اور مضبوط ترین طاقت"۔ موائے نیہان نے تشریح کی کہ پہلے امریکہ "سلیٹ" کو صاف کرنا چاہتا ہے۔" عملاً اس سے مراد پاکستان کے لئے ۳۰۰ آہنی فوج بردار گاڑیاں، ۱۱ لاکھ ڈالر کی مالیت کے فالتو پرزے اور ہوائی جہاز کے وہ انجن جو امریکہ مرمت کے لئے گئے تھے، وغیرہ ہیں۔ موائے جب کسی کو قائل کرنا چاہتا ہے تو انتہائی دلبر ہو جاتا ہے۔ اور اس نے مسز اندرا گاندھی کو یقین دلایا ہے کہ ہتھیاروں کی یہ کھیپ صرف "ایک ہی مرتبہ کے لئے مستثنیات میں سے ہے"۔ اور یہ کہ امریکہ نے "شعوری فیصلہ" کرلیا ہے کہ پاکستان کو مزید "مہلک ہتھیار" نہیں دیگا۔ ان دلائل نے، بمع آٹھ کروڑ ۶۷ لاکھ ڈالر کی معاشی امداد کے، مسز اندرا گاندھی کو کڑوی گولی نگلنے پر آمادہ کرلیا ہے"۔

امریکہ نے بھارت کے بارے میں جو جدید سیاست عملی اختیار کی ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے "جیسا کہ ایک مغربی ذمہ دار نے کہا ہے۔ "بھارت کو بیرونی حملوں کی فکر نہیں ہونی چاہیئے"۔ "اس کا روایتی دشمن پاکستان مٹھونک ٹھانک کر زمین پر گرا دیا گیا ہے"۔ امریکہ کی جدید بالغ تر سیاست عملی کے ثبوت کے بارے میں ایک اور امریکی سفارتی نمائندہ یہ اضافہ کیا، "ہم نے مسز گاندھی اور اوپر کے ذمہ داروں پر یہ وضاحت کر دی ہے کہ ہم اب ان کو ان کی ظاہری حیثیت سے قبول کریں گے۔ ہم ان سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ صرف وہ کہیں جو ان کا مطلب ہے"۔

جو ہر ایک کو معلوم ہے، یہ ہے کہ ہندوستان بھی پانچوں سواروں میں شامل ہونا چاہتا ہے اور اپنے چھوٹے پڑوسیوں کو دھونس میں رکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ مشرقی پاکستان کے بعد سکم پر اس کے حملے سے ثابت ہو گیا ہے۔

سوال تو پاکستانیوں سے ہے، کیا آپ امریکہ کے لئے سنگاپور بنیں گے، فاقہ مستیوں سے ملک گنوائیں گے، یا پاکستان کو مستقل بالذات، آزاد، قوی، ترقی یافتہ ملک بنائیں گے۔ رہی امریکہ کی دوستی تو یہ حدیث یاد رکھیئے "مومن ایک بل سے دوبارہ نہیں ڈسا جاسکتا"۔ لیکن ہم تو دوبار ڈسے جاچکے ہیں۔

واشنگٹن پاکستان نواز پالیسی تبدیل کر رہا ہے۔ بھارت میں مقیم امریکی سفیر

فاروق پراچہ

مکتوب کابل

صدر! میرے صدر

سفارت خانے کا ہر افسر حاکم ہے

محترم صدر!

میں آپ کا پرانا مداح ہوں۔ لاکھوں عوام کی طرح میں نے بھی اپنے تئیں آپ کی مقبولیت کا بھرم قائم رکھنے کے لئے اپنے حلقۂ احباب میں جہاں تک میرے وسائل مجھے اجازت دے سکتے تھے، حتی المقدور آپ کی خدمت کی ہے۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب آپ سابق صدر ایوب کی کابینہ سے استعفیٰ دینے کے بعد پہلی بار کراچی تشریف لائے تھے۔ کراچی کینٹ اسٹیشن پر لاکھوں عوام کا مجمع تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں بھی کسی سیاسی رہنما کے جلوس میں شریک ہوا۔ تاشقند کے نام نہاد معاہدے کے بعد آپ کے رویے نے آپ کی شخصیت کو کچھ اس قدر پرکشش بنا دیا تھا کہ دل بے اختیار آپ کی طرف کھنچتا تھا۔ غریب عوام، مزدوروں اور کسانوں کے بارے میں آپ کی تقریریں سن سن کر میں نے اپنے ذہن میں آپ کی ایک خیالی تصویر بنائی۔ ایک ایسی تصویر جو اندھیرے میں روشنی کی کرن کی طرح نمودار ہوتی ہے۔

میں بنیادی طور پر صحافی ہوں۔ میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت کے پیشے سے کیا۔ میں جس اخبار میں ملازم تھا، وہاں کے ملازمین کی اکثریت رجعت پسند تھی۔ یہاں جماعت اسلامی اور اسی قماش کی دوسری سیاسی پارٹیوں کا بول بالا تھا۔ اپنی کسی تحریر میں آپ کا ذکر کرنا یہاں جرم تھا۔ ہم نے اس جرم کو سینے سے لگایا اور جب بھی موقع ملا آپ کے پیغامات کو عوام تک پہنچایا۔ اس پاداش میں ایک بار نوکری سے برخاست بھی ہوئے لیکن آپ کے دیگر لاکھوں چاہنے والوں کی طرح ہم نے بے روزگاری کے اس تلخ گھونٹ کو صبر و تحمل کے ساتھ پی لیا۔ آپ سے ایک بار نہیں کئی بار کراچی میں اپنے مختلف دوستوں کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ آپ کی نجی گفتگو، تقریروں اور بیانات کی گرمی اب تک سینے میں محسوس ہوتی ہے۔

پھر آپ سابق صدر ایوب کے زمانے میں جب جیل چلے گئے تو ہمیں یوں لگا جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہو۔ جیسے آمریت کے قلعے کی فصیلیں کچھ اور بلند ہو گئی ہوں۔ جیسے ملک کے گرد رجعت پسندی اور استحصالی نظام کا دائرہ اور تنگ ہو گیا ہو۔ ایسے میں اصغر خان صاحب نے آپ کے نامکمل مشن کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ہم نے ان کی آواز پر لبیک کہا، ان کا ساتھ دیا، ان کے جلوس میں شریک ہوتے۔ ان کی شخصیت میں آپ کا پرتو نظر آیا تو بے اختیار ان کی پرستش میں مصروف ہو گئے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اصغر خان صاحب آپ کی مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی رجعت پسندی کے عزائم پورے کرنا چاہتے تھے۔ وہ پرانے استحصالی نظام کو سہارا دینے کے لئے آگے بڑھے تھے۔ عوام کو جب ان کے عزائم کا پتہ چلا تو ان کی مقبولیت کا محل زمین پر آ رہا تھا۔ پاکستان کے باشعور مزدوروں اور کسانوں نے انہیں ٹھکرا دیا۔ اس کی مثال گذشتہ انتخابات میں آپ کے ایک معمولی کارکن کے ہاتھوں ان کی عبرت ناک شکست سے ملتی ہے۔ اصغر خان صاحب اب بھی استحصالی نظام کی لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھائے رواں دواں ہیں۔ وہ اپنے گھٹیا حربوں سے اس لاش کے سینے میں نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں لیکن وہ وقت سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان میں سیاسی تدبر کا فقدان ہے۔ ان کی سیاسی حکمتِ عمل انتہائی فرسودہ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ پاکستان کے ایک گمنام اور عوام کے ٹھکرائے ہوئے سیاست دان نوابزادہ نصر اللہ خان کے ہاتھوں مات کھا گئے، جب انہوں نے اپنی نوزائیدہ جسٹس پارٹی کو پی ڈی پی میں مدغم کر دیا۔ اصغر خان صاحب اب فوج کی مدد کے خواہاں ہیں۔ عوام میں ان کی مقبولیت کی جڑیں کس حد تک پیوست ہیں، اس کا اندازہ انہیں اچھی طرح سے ہے۔ انہیں یقین ہے کہ عوام کے تعاون سے وہ آپ کی مقبولیت کے قلعے میں شگاف نہیں ڈال سکتے۔ اب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر فوج کو ایک بار پھر اس گندی سیاست میں گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے "پاکستان ٹائمز" کے مطابق ایک سازش تیار کی تھی۔ جب ہی تو وہ اپنی تقریروں میں کہتے پھرتے تھے کہ پاکستان میں ہر قیمت پر نئے انتخابات ہوں گے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ سازش کامیاب ہو جائے گی۔ آپ کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ لیکن آپ کی بروقت مداخلت نے اصغر خان صاحب کو اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

اصغر خان صاحب پٹے ہوئے مہرے ہیں۔ عوام میں ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ لیکن وہ پاکستان کی مسلح افواج کے اتحاد و اتفاق میں رخنہ ڈالنے کی ضرور کوشش کرتے رہیں گے۔ آپ اس طرف خصوصی توجہ دیجئے۔

جنابِ صدر! اب میں صحافت کے پیشے کو خیرباد کہہ چکا ہوں۔ اور ایک بڑی کمپنی کے معمولی کارکن کی حیثیت سے گذشتہ ایک سال سے کابل میں مقیم ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ خارجی تعلقات کے ماہر ہیں۔ پاکستان کے ایک لاکھ جنگی قیدیوں کی رہائی کے بارے میں گذشتہ چند دنوں سے آپ کے بھیجے ہوئے مختلف وفود نے دنیا کے مختلف ممالک میں اپنی موثر کارکردگی سے رائے عامہ کو بڑی حد تک پاکستان کے حق میں ہموار کر لیا ہے لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بیرونی ممالک میں پاکستان کے سفارت خانوں کی کارکردگی اس سلسلے میں صفر کے برابر ہے۔ ان سفارت خانوں کے عہدہ دار سارا دن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرتے

بیرونی ممالک میں سفارتخانوں کی کارکردگی - صفر

ہیں، عالیشان بنگلوں میں رہتے ہیں۔ قیمتی کاروں میں گھومتے ہیں نائٹ کلبوں کی رونق بڑھاتے ہیں، جام و مینا سے دل بہلاتے ہیں لیکن انہوں نے مختلف مسائل پر اپنے ملک کے نکتۂ نظر کو کہاں تک واضح کیا ہے اس کا جواب آپ ان سے نہیں بلکہ ان ممالک میں رہنے والے پاکستانی باشندوں سے پوچھیے۔

کابل کی مثال لیجئے۔ شہر نو میں یہاں کے سفارت خانے کی اندرونی حالت انتہائی خستہ ہے۔ کابل میں آپ کسی بھی سفیر اور وزیر سے بلا روک ٹوک ہر وقت مل سکتے ہیں لیکن پاکستانی سفارت خانے کے کسی افسر سے ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہاں ہر افسر حاکم ہے۔ وہ پاکستانیوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ کسی افسر سے ملاقات کرنی ہو تو استقبالیہ سے ہی ٹال دیا جاتا ہے۔ ایک کتب خانہ ہے جہاں پشاور، لاہور اور راولپنڈی کے اخبارات آتے ہیں لیکن یہ کتب خانہ عام طور سے بند رہتا ہے۔ افغانستان میں جنگی قیدیوں کے بارے میں

آپ کے گرد جمع ہونیوالی کنونشن لیگی مکھیوں کی بھنبھناہٹ "سب ٹھیک ہے"

پاکستان کے نکتۂ نظر کو واضح کرنے کی کوئی ٹھوس کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں کے عوام قدرتی طور پر پاکستان سے برادرانہ تعلقات کے خواہاں ہیں ورنہ پاکستانی سفارت خانے نے اس سلسلے میں اب تک کچھ نہیں کیا۔

میں سوچتا ہوں کہ خارجی امور کے ماہر صدر کی موجودگی میں بیرونی ممالک میں پاکستانی سفارت خانوں کی ایسی خستہ حالی کا آخر کیا جواز ہے۔ میرے خیال میں سیاسی رشوت کے طور پر دی جانے والی سفارتیں اب تک بالکل نا اہل ثابت ہوئی ہیں۔ یہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ عوامی، سیاسی، مخلص اور تجربہ کار شخصیتوں کو سفیر بنایا جائے۔ ایسی شخصیتیں جن کے دلوں میں کوئی غرض پوشیدہ نہ ہو، جو اپنے ملک اور اس کے عوام کے لئے ہمدردی اور محبت رکھتے ہوں۔

جناب صدر! میں اپنے ملک میں نہیں ہوں لیکن میرا دل ہر وقت وہیں دھڑکتا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر ہول آتا ہے کہ آپ کے رفیق، آپ کے ساتھی ایک ایک کر کے آپ کا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ وہ کہتے ہیں کہ آپ کے اردگرد ایسے اشخاص جمع ہو گئے ہیں جو آپ کے شریک سفر نہیں تھے۔ ان کے غلط مشوروں اور تدبیروں نے آپ کی نیک نامی کو داغدار کر دیا ہے۔ یقین جانیئے! آپ کے کنونشن مسلم لیگی وزیر آپ کی شہرت اور مقبولیت کا تابوت تیار کر رہے ہیں۔ عوام کے ذہنوں پر چھایا ہوا آپ کی شخصیت کا خوبصورت پرتو اب آہستہ آہستہ دھندلاتا جا رہا ہے۔ آپ عوام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک ایسی شخصیت جو انتخابات سے پہلے دن میں بیس بیس جلسوں سے خطاب کرتی تھی، اب چیمبر آف کامرس کے جلسوں تک محدود ہو گئی ہے، آپ نے گذشتہ چھ ماہ سے کسی عوامی جلسے سے خطاب نہیں کیا۔ عوام آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں، سُننا چاہتے ہیں۔ لیکن یوں لگتا ہے جیسے آپ رجعت پسندوں کے ہتھکنڈوں سے خائف ہو کر عوام کے سامنے جانے سے احتراز کر رہے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو سانگھڑ میں برستی گولیوں کے سائے میں عوام سے خطاب کرتے ہوئے نہیں ہچکچایا، آخر اب وہ کس چیز سے خوفزدہ ہے۔؟

مزدور آپ سے ناخوش ہیں، کسان مطمئن نہیں، طلباء بےچین ہیں، سازشیں تیار ہو رہی ہیں، جلوس نکل رہے ہیں، جلسے ہو رہے ہیں۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ سیاسی قیدیوں سے جیلیں بھری جا رہی ہیں۔ کیوں۔؟ آخر کیوں؟؟ میں جانتا ہوں آپ کا مقابلہ رجعت پسندوں سے ہے۔ ان کے ہتھکنڈے، ان کی سازشیں گہری ہیں۔ لیکن ایسی صورت میں جب کہ آپ کے پُرانے ساتھی جنہیں آپ نے ایک بار اپنا جانشین تک نامزد کر دیا تھا، آپ کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں تو آپ ان سازشوں اور ان ہتھکنڈوں کا مقابلہ کیسے کریں گے۔؟ یقین جانیئے! کنونشن لیگی، سرمایہ دار، وڈیرے جنہوں نے آپ کی شخصیت کے گرد گھیرا تنگ کر دیا ہے، آپ کے مخلص رفیق نہیں۔ انہوں نے ایوب خان جیسے آمر کو بھی دھوکا دیا تھا، اب وہ آپ کے گرد جمع ہیں۔ یہ آپ کی پارٹی کے منشور کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ کہاں ہے روٹی؟ کہاں ہے کپڑا؟؟ کہاں ہے مکان؟؟؟ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ غریب عوام اور غریب ہو رہے ہیں۔ کارخانے بند ہو رہے ہیں، چھانٹیاں ہو رہی ہیں، زمینوں سے بے دخلیاں ہو رہی ہیں، ڈاکے پڑ رہے ہیں، چوریاں ہو رہی ہیں، میں جانتا ہوں آپ ان حالات سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ہو سکتا ہے نہ بھی ہوں۔ کیونکہ آپ کے اردگرد جمع ہونے والی مکھیوں نے آپ کو "سب ٹھیک ہے" کا خواب دکھایا ہوگا لیکن دیارِ غیر میں رہنے والے اپنے ایک مداح کی درخواست پر غور کیجئے اور خدا کے لئے اپنے عوام میں لوٹ جائیے۔ ان سے رشتہ نہ توڑیئے۔

میر رسول بخش تالپور ہوں یا معراج محمد خان، طارق عزیز ہوں یا احمد رضا قصوری، انہیں منائیے۔ ان کی باتیں سنیئے جس طرح آپ انتخابات سے پہلے سنتے تھے۔ یہی لوگ قربانیاں دینے والے ہیں۔ رجعت پسندوں کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ یہی لوگ کر سکتے ہیں۔ انہیں آپ کئی بار آزما چکے ہیں۔ بددیانت مشیروں اور وزیروں سے پیچھا چھڑائیے۔

جنابِ صدر! مصطفٰے کھر اور عزیز احمد کے دورۂ امریکہ نے پاکستان کے لئے امریکی اسلحہ کی راہیں کھول دی ہیں لیکن یہ راہیں ہمیں کہاں لے جائیں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ روسی اسلحہ کا مقابلہ امریکی اسلحے سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا عوام کو اس کے لئے تیار کیا گیا ہے؟ ایک زمانہ تھا کہ جب آپ بھارت کو اپنی تقریروں میں للکارا کرتے تھے۔ "دمادم" کا نعرہ مارتے تھے۔ لاکھوں عوام اس نعرے کا جواب دیتے تھے۔ دراصل یہ نعرہ عوام کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ آپ نے اس دھڑکن کو اپنے دل کی دھڑکن بنایا لیکن ---- لیکن اب یہ نعرہ کہاں کھو گیا ہے؟ یہ نعرہ کس مصلحت کا شکار ہو گیا ہے؟ پاکستان کے جنگی قیدیوں کا مسئلہ بلاشبہ ہمارے لئے سب سے اہم مسئلہ ہے۔ انہیں ضرور رہا ہونا چاہیئے، لیکن جنگی قیدیوں کے اہلِ خاندان کا سڑکوں اور اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے سامنے آہ و زاری کرنا ہماری روایات کے منافی ہے۔ جنگی قیدیوں کے اہل خاندان کو سڑکوں پر ماتم کرتے دیکھ کر میرا سر ندامت سے جھک جاتا ہے یہ غازیوں کی بیویوں اور بچوں کی شان کے خلاف ہے۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ جنگ میں لوگ شہید بھی ہوتے ہیں اور قیدی بھی بنتے ہیں۔ اپنے جنگی قیدیوں کو رہا کرانے کا یہ طریقہ کار میرے نزدیک مناسب نہیں۔ گریہ و زاری کی باتیں بھارت کو تو زیب دیتی ہیں کہ ان کی پوری تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے، لیکن کیا ہمیں یہ بات زیب دیتی ہے؟

بلاشبہ ہم بھارت سے جنگ نہیں چاہتے۔ دنیا کے کسی ملک سے دشمنی رکھنا ہماری خارجہ پالیسی کا اصول نہیں بننا چاہیئے، لیکن ہم دنیا کے کسی ملک کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہم پر آئے دن اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ بھارت ہم پر اپنی برتری ثابت کرتا ہے۔ اس کے ذرائع ابلاغ عامہ ہمیں رسوا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اس کا رویہ جارحانہ ہے۔

حکومت کے بروقت اقدام سے اصغر خان کا منصوبہ ناکام ہوگیا

اس نے بنگلہ دیش کو جنم دیا۔ پختونستان کی آواز بلند کی، سندھو دیش کا ہتوا کھڑا کیا۔ ہمارے لئے نت نئے مسائل پیدا کئے۔ کشمیر کو ہڑپ کیا، حیدر آباد دکن، جوناگڑھ، ماناوادر پر فوج کشی کے ذریعے اپنا تسلط قائم رکھا۔ ایسی صورت میں اس کے ساتھ دوستی اور صلح کی باتیں ہماری کمزوری کو ظاہر کرتی ہیں

جنابِ صدر! عوام بھارت سے دوستی کے بالکل خواہاں نہیں۔ دوستی برابری کے اصولوں پر قائم رہتی ہے۔ جارح اور توسیع پسند بھارت کے ساتھ ہم "ایک ہزار سال تک لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ اس سلسلے میں آپ ہماری رہنمائی کیجئے۔ لیکن اصولوں کا سودا نہ کیجئے۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں کو پہچانیئے "چین ہمارا دوست ہے" یہ نعرہ بھی آپ نے دیا تھا۔ لیکن اب اس نعرے میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا جو گذشتہ انتخابات سے قبل تھا۔ پاکستان میں آپ اور آپ کی پارٹی کو چین کا سب سے بڑا حامی سمجھا جاتا تھا لیکن آپ کو مسندِ اقتدار پر بیٹھے ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا، چین کی کسی بڑی شخصیت نے اب تک پاکستان کا دورہ نہیں کیا۔ دوستی کے یہ رشتے کیسے ہیں؟ آپ تو یحییٰ خان کے دورِ اقتدار میں کہتے تھے کہ خارجہ پالیسی میں کسی اہم تبدیلی کے وقت اپنے دوست ملک سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ کیا آپ اب بھی اس اصول کے حامی ہیں؟ امید ہے آپ نے سیٹو سے ناطہ قائم رکھنے اور امریکی اسلحہ کو حاصل کرنے کے بارے میں چین سے ضرور مشورہ کیا ہوگا کیونکہ چین ہمارا دوست ہے۔ اس نے آڑے وقتوں میں ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے اور اب بھی دے رہا ہے۔

رہی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی بات، سچ پوچھیئے تو آپ اس معاملے میں عوام کی نبض نہ پہچان سکے۔ رجعت پسند جماعتوں نے آپ کی اس لغزش کا خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ تو ہمیشہ سے آپ کی لغزش کے منتظر تھے۔ آپ نے غیر شعوری یا شعوری طور پر انہیں یہ موقع فراہم کر دیا۔ بھارت کے اخبارات اور ریڈیو پاکستان کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرلے۔ آپ خود سوچیئے کیا بھارت پاکستان کو کبھی کوئی مخلصانہ مشورہ دے سکتا ہے؟

جنابِ صدر! وہ زمانہ گیا جب عوام لیڈر کے پیچھے بھاگتے تھے۔ اب کوئی لیڈر اپنا کوئی فیصلہ عوام پر مسلط نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے اسے بہرحال پہلے عوام سے منظوری لینا ہوگی یقین جانیئے! عوام بنگلہ دیش کو رد کر چکے ہیں۔ وہ آپ سے اس بات کے خواہاں تھے کہ آپ بھرے جلسے میں بنگلہ دیش اور اس کے خالق پر دو حرف بھیجیں گے۔ لیکن آپ نے یہ کیا کیا کہ بھرے مجمع میں بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی بات کہہ کر لاکھوں عوام کے جذبات کو مجروح کر دیا۔ ہم اس بات کی توقع نیشنل عوامی پارٹی سے تو کر سکتے تھے کیونکہ عوام کے جذبات کو مجروح کرنا اس کا شیوہ ہے، لیکن آپ وقتی مصلحتوں کا کیوں شکار ہوگئے؟

جنابِ صدر! قومی اسمبلی ان دنوں آئین بنانے میں مصروف ہے، یہ آئین ضرور بنے گا۔ آپ کو اسمبلی میں قطعی اکثریت حاصل ہے لیکن کیا یہ آئین عوام کی توقعات پر پورا اترتا ہے۔؟ اخبارات میں آئین کا جتنا بھی حصہ شائع ہوا ہے، میں نے اس کی ایک ایک شق کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ لیکن مجھے اس میں کہیں بھی روٹی، کپڑے اور مکان کی ضمانت نظر نہیں آئی۔ اور نہ ہی سوشلزم کے کسی مؤثر اصول کو اس آئین میں جگہ دی گئی ہے۔ آپ نے انتخابات سوشلزم کے نعرے کے ذریعے جیتے تھے۔ عوام نے آپ کو ووٹ دیکر دراصل سوشلزم کے حق میں اپنا فیصلہ دیا تھا۔ لیکن یہاں بھی آپ وقتی مصلحتوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ اس سلسلے میں رجعت پسندوں کے تابڑ توڑ حملوں سے آپ خائف نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کے مخلص دوستوں کے خواب ادھورے رہ گئے "اسلامک سوشلسٹ ری پبلک آف پاکستان" کا خواب کسی صورت پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ آپ نے انتخابات سے قبل ایک راہ سجھائی تھی لیکن یہ راہ ہمیں وڈیروں کی زمینوں اور صنعت کاروں کے کارخانوں کی طرف لئے جارہی ہے۔ یہ راہ ان تنگ و تاریک بستیوں کی طرف نہیں جاتی جہاں بھوک اور افلاس نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کا آئین آپ کے مخلص دوستوں اور عوام کے جذبات کی عکاسی کرتا تو پھر ہم دیکھتے کہ رجعت پسند جماعتیں آئین بنانے کی راہ میں کیسے روڑے اٹکاتی ہیں۔

جنابِ صدر! کہنے کی تو بہت سی باتیں ہیں، لیکن صفحات کی کمی کی وجہ سے میں اپنی درخواست یہیں ختم کرتا ہوں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ ہمارا یہ رسالہ ان دنوں کتنی مالی مشکلات سے دوچار ہے۔ ہمارے پاس اخباری کاغذ کا کوئی کوٹہ نہیں ہم بازارِ سیاہ سے کاغذ خریدتے ہیں۔ اگر زندگی ہوئی تو آپ سے مزید باتیں بھی ہوجائیں گی۔

پنجاب تیرے بد





نعیم الحسن

سارا شہر ہفتۂ جشن آئین منانے میں مصروف ہے۔ جگہ جگہ چراغاں ہے، مکانوں، دوکانوں، سڑکوں اور چوراہوں پر رنگ برنگی جھنڈیاں ہوا سے پھڑپھڑا رہی ہیں۔ ہر چیز دُلہن کی طرح نکھری نکھری اور سجیلی نظر آ رہی ہے۔ لانس نائک قربان شاہ (ان دنوں بھارت کی قید میں ہے) کا دس سالہ لڑکا بڑی حیرت اور تعجب سے یہ خوشگوار تبدیلی دیکھ رہا ہے۔ اس کا چھوٹا سا دل ایک انجانی مسرت سے دھڑک رہا ہے، اس نے راہ چلتے ہوئے ایک بڑے میاں کا ہاتھ پکڑ کر پوچھ لیا "بازار میں جھنڈیاں کیوں لگائی جا رہی ہیں" بڑے میاں نے بڑی شفقت سے اس کی جانب دیکھا اور اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قربان کے لڑکے خدا تجھے سلامت رکھے۔ یہ ساری تیاریاں آئین کی خوشی میں کی جا رہی ہیں"

قربان شاہ کے لڑکے نے خوش ہو کر سوال کیا۔ "کیا ہمارے ابا جلد ہی گھر واپس آجائیں گے"؟

بڑے میاں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ ان کا ہاتھ کپکپانے لگا۔ وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئے۔

قربان شاہ کے بچے نے بڑے میاں کی خاموشی کا مطلب یہی لیا کہ اس کا بابا بھارت کی قید سے چھوٹ کر بس گھر آنے والا ہے۔ وہ بھاگ کر اپنے گھر پہنچا اور اپنی ماں کا پلو کھینچتا ہوا زور سے چلّایا — امّاں — امّاں۔ ابا گھر آنے والا ہے — باہر تیاریاں ہو رہی ہیں"

ماں نے اپنے بیٹے کو کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس نے اسے زور سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ اس کی سوگوار آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔ انتظار کی گھڑیاں اس پر قیامت بن کر ٹوٹ رہی ہیں۔

یہ بھارت کی قید میں زندگی گزارنے والے ایک لانس نائک قربان شاہ کے گھر کی کہانی نہیں ہے، بلکہ نوّے ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کی دلگداز داستان ہے۔ جو زہریلے ناگ کی طرح ہر گھر اور گھر کے ہر مکین کو ڈس رہی ہے۔ یہ یخ بستہ اور طویل ترین رات کی بھیانک کہانی ہے جسے سُن کر انسانی چہرے آنسوؤں سے تر بتر ہو جاتے ہیں۔ تیز اور طوفانی ہوا سے کسی کی آمد کے انتظار میں کھلے ہوئے دروازے زور زور سے بجنے لگتے ہیں۔ لیکن قدموں کی آہٹ فریب بن جاتی ہے پیروں کی ہر چاپ پہ دل دھڑکتا ہے، مگر باہر کوئی نہیں ہوتا۔ رات کی گہری خموشی میں سناٹا بولتا ہے اور آنکھیں انتظار کی آگ میں سُلگتی رہتی ہیں۔ روتی رہتی ہیں

راوی کا پانی خشک ہے۔

جہلم سوکھ کر ویران ہو گیا ہے۔ اس کے سینے میں دراڑیں پڑ گئی ہیں، لیکن پنجاب کی دھرتی آنسوؤں سے سیراب ہے۔ کھڑی فصلوں کو گدگدانے والی ہوائیں نوحہ کناں ہیں۔ رہٹ کے پانی سے نغمے نہیں پھوٹتے، درد میں ڈوبے ہوئے المناک گیت فضا میں بکھرتے ہیں۔ واہگہ کے اِس پار پنجاب کا ہر گھر مجسم انتظار ہے، اپنے پیارے شناسا چہروں کی راہ تک رہا ہے۔ اور واہگہ کے اُس

امرتا پریتم تمہارا دردمند دل کیوں نہیں تڑپتا؟

ٹے کب واپس آئیں گے؟

پار پنجاب کی چاہت اور محبت کے گیت گانے والی امرتا پریتم جانے کس خیال کو اپنے مدھر شعروں کا موضوع بنانے میں مصروف ہے۔ شاید ابھی تک وہ اپنے دکھ سے ناآشنا ہے۔ جو اس کا اپنا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اُس کا دل کیوں نہیں دھڑکتا، اس کے شعر چیخ، احتجاج بن کر سیاسی مصلحتوں کے جال کو کیوں نہیں توڑ دیتے۔ وہ کیوں نہیں لکھتی۔ پنجاب مجھ سے تیرا یہ دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ تیری خون روتی ہوئی آنکھیں، مجھے تڑپاتی ہیں، میں تیرے بیٹے واپس کر رہی ہوں کہ یہ میرے بھی بیٹے ہیں۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں ؎

اِک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وَین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
اُٹھ درد منداں دے دردیا اٹھ تک اپنا پنجاب
اَج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب

امرتا پریتم بولو۔ کچھ تو جواب دو۔ پنجاب کی لاکھوں بیٹیاں اپنی ماں کو پکار رہی ہیں ننھے ننھے بیٹے اپنے ہاتھوں کو بلند کر کے آواز دے رہے ہیں، کہ سرحد کے اس پار ان کے باپوں، بھائیوں اور رشتہ داروں کو خاردار تاروں میں جانوروں کی طرح بند کر دیا گیا ہے۔ انہیں ان کے گھر جانے سے روک دیا گیا ہے جہاں ان کی مائیں، بیویاں، بیٹے اور بیٹیاں ان کی آمد کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ کئی عیدیں آئیں اور چلی گئیں۔ کئی تہوار آئے اور خاموشی سے گزر گئے۔ مگر ملاپ کی گھڑی نہ آئی بجھے ہوئے دل روشن نہ ہوئے۔ اور تم خاموش ہو، تمہاری آنکھیں کیوں نہیں بھیگیں، تمہارا دل کیوں نہیں تڑپا؟ آج پنجاب کی ایک دھی نہیں لاکھوں دھیاں خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ پنجاب کے دُکھ سے تڑپنے والا تمہارا ہمدرد دل چپ چاپ کیوں ہے۔ بولو، خدا کیلئے کچھ تو بولو۔ بھارت کے اس غیر انسانی ظلم کے خلاف تم سراپا احتجاج کیوں نہیں بن جاتیں کہ تمہارا احساس دل کبھی کسی مصلحت کی پرواہ نہیں کرتا۔ تم شاعرہ ہو، فنکارہ ہو، دنیا بھر کا دُکھ تمہارا اپنا دُکھ ہے۔

پنجاب کی محبت میں گیت گانے والی امرتا پریتم سنو آج میں تمہیں اپنی دکھ بھری کہانی سنا رہا ہوں۔ تمہیں سننی پڑے گی۔ غور سے سنو۔

ہر گھر مجسم انتظار بن چکا ہے۔

بھارت نے دسمبر جنگ کے دوران عالمی برادری سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستانی جنگی قیدیوں سے جینوا کنونشن کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ لیکن بھارت سرکار نے اپنا وعدہ ایفا نہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال ہونے کو آیا لیکن بھارت نے ترانوے ہزار جنگی قیدیوں کو رہا نہ کیا۔ ان کے ساتھ جنگی کیمپوں میں جانوروں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اب تک سینکڑوں پاکستانی جنگی قیدیوں کو مختلف بہانوں سے ہلاک کر دیا گیا۔ عالمی ریڈ کراس کی رپورٹ اس بات کی گواہی دے گی کہ بھارت ان قیدیوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے میں چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر کو مات کر چکا ہے۔ جنگی کیمپوں کی لرزہ خیز داستانیں دھیرے دھیرے متمدن دنیا میں پھیل رہی ہیں، عالمی برادری حیران ہے کہ بھارت آہنسا اور انسانیت کا لبادہ اوڑھ کر کس ڈھٹائی سے اس کے مسلمہ اصولوں کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔ ایک خالص انسانی مسئلے کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ دسمبر کی جنگ کے دوران پاکستان کے ترانوے ہزار فوجیوں نے مشرقی پاکستان کا دفاع کرتے ہوئے بھارت کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ بھارت اپنے طور پر ان کی رہائی کا حکم دے سکتا ہے، لیکن محض اس مسئلے کو الجھانے اور سیاسی فائدہ اٹھانے کے لئے اُسے بنگلہ دیش کے ساتھ نتھی کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً متعدد قسم کی شرائط بھی پیش کر دیں۔ یہ دنیا کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد افسوسناک واقعہ ہے کہ ایک فاتح ملک نے ایسے متکبرانہ انداز سے ان اصولوں کا مذاق اڑایا، جنہیں متمدن دنیا نے بڑی کاوشوں کے بعد تیار کیا تھا۔ اس معاملے میں جینوا کنونشن محض ایک کاغذی دستاویز، ثابت ہوا، زبردست کے انگوٹھے نے "انسانی اصولوں" کے تحفظ کے اس "عالمی عہد نامے" کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ اور پوری عالمی برادری اب تک محو تماشہ بنی ہوئی ہے ایک طرف بھارت برصغیر پاک و ہند میں کشیدگی ختم کرنے کی بات کرتا ہے۔ دوسری جانب ترانوے ہزار پاکستانی باشندوں کو غیر قانونی طور پر نظر بند رکھ کر ایک پوری نسل کے دل و دماغ میں نفرت اور انتقام کی آگ بھر رہا ہے۔ یہ کہاں کی آہنسا ہے یہ کیسی ڈپلومیسی ہے۔؟

بھارت ترانوے ہزار پاکستانی فوجیوں اور شہریوں کو مسلسل نظر بند رکھ کر کوئی سیاسی مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ عالمی برادری میں اب پاکستان کے موقف کو ہمدردی سے سُنا جا رہا ہے۔ چین کے وزیراعظم چو این لائی نے ایک برطانوی صحافی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا "چند ہزار امریکی فوجیوں کی رہائی میں معمولی تاخیر سے آپ تو کھلا گئے لیکن پاکستان کے



بھارت ایک پوری نسل کے ذہن میں نفرت کا زہر گھول رہا ہے

نوّے ہزار فوجیوں کی مسلسل نظربندی کے انتہائی غیر انسانی واقعہ پر آپ کا دل نہیں چیختا۔ یہ کہاں کی انسانیت ہے؟" چین کے وزیر اعظم کے الفاظ عالمی ضمیر کے مُنہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے۔ اگر ان صحافیوں کا دل بنگالی عوام کی ہمدردی میں تڑپ سکتا ہے تو ان کا قلم پاکستانی فوجیوں اور بے گناہ شہریوں کی غیر انسانی نظربندی اور ان پر توڑے جانے والے مظالم پر بھی خون کے آنسو رو سکتا ہے اگر وہ اپنا عالمی فرض پورا نہیں کرتے اور مصلحت پسندی کا شکار ہوتے ہیں تو وہ اپنے پیشے اور اپنے قلم کو سر بازار رسوا کرتے ہیں۔ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ دنیا بھر کے اخبارات میں کام کرنے والے صحافی اس مسئلے کو حل کرانے میں ایک مثبت اور تاریخی کردار انجام دیں۔

دسمبر کی پاک بھارت جنگ کو ختم ہوئے کم و بیش ۱۶ ماہ گذر چکے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں متعدد بار کوششیں کی جا چکی ہیں، لیکن ابھی تک کوئی معقول راستہ سامنے نہیں آیا۔ بھارت ہر بار کوئی نہ کوئی نئی شرط پیش کر کے اس مسئلے کو طول دیدیتا ہے۔ تازہ ترین تجویز یہ آئی ہے کہ بھارت اور بنگلہ دیش پاکستان کے جنگی قیدیوں کو اس شرط کے ساتھ رہا کرنے پر رضا مند ہو جائیں گے کہ پاکستان تمام بنگالی باشندوں کو بنگلہ دیش بھیج دے اور بنگلہ دیش میں مقیم تمام غیر بنگالی باشندوں کو پاکستان بُلایا جائے۔ اس "انوکھی تجویز" کے بارے میں حکومت ہی کوئی جواب دے سکتی ہے، ہم تو صرف اتنا کہیں گے کہ انسانوں کی اس کثیر تعداد کے ساتھ بھارت اور بنگلہ دیش کا یہ رویہ انتہائی شرمناک ہے۔ بنگلہ دیش میں رہنے والے غیر بنگالیوں کے بارے میں یہی تاثر دیا جا رہا ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں بنگلہ دیش کی سرزمین میں رکھا جائے۔ حالانکہ یہی غیر بنگالی بنگلہ دیش کی تعمیر و ترقی میں ایک فعال کردار انجام دے چکے ہیں۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ پاکستان کی ایک فسطائی جماعت نے "نظریۂ پاکستان" کی آڑ میں انہیں اپنے مقصد کے لئے بار بار استعمال کیا اور مقامی باشندوں میں غیر مقبول بنا دیا۔ اس میں ان غیر بنگالیوں کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں، حکمران ٹولے، نوکر شاہی اور جماعت اسلامی کا ہاتھ ہے۔ ایوب خان اور یحییٰ کے آمرانہ دور میں تو ان غیر بنگالیوں کو باقاعدہ ایک سیاسی دھڑے میں تبدیل کر دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان میں آباد غیر بنگالی، مقامی آبادی سے کٹ کر رہ گئے۔ دونوں آبادیوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کے بیج ڈال دیئے گئے۔ اس میں بے چارے غیر بنگالیوں یا بہاریوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ شیخ مجیب اور اندرا گاندھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں، لیکن وہ ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے اس بات کو تسلیم کرنے پر تیار نظر نہیں آتے۔ اور انہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی طرح بنگلہ دیش کی سرزمین سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں۔ بھارت اور بنگلہ دیش کی تازہ ترین پیشکش کے پیچھے بھی نفرت کا یہی جذبہ کارفرما ہے۔

جنگی قیدیوں کی رہائی کے مسئلے کو مشروط بنا کر بھارت اور بنگلہ دیش عالمی برادری میں مزید رسوائی مول نہیں لیں گے۔ اگر انہیں عالمی اصولوں کا ذرّہ برابر بھی خیال ہے اور یہ دونوں ممالک دل سے چاہتے ہیں کہ بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان تمام تنازعات باعزت طریقے سے حل ہو جائیں اور برصغیر میں ایک پائیدار امن قائم ہونا چاہیئے تاکہ خیر سگالی کے ماحول میں دوسرے سنگین نوعیت کے مسائل سُلجھانے میں آسانی ہو جائے۔

پاکستان کا ہر وہ گھر جس کا کوئی فرد ان دنوں بھارت کے جنگی کیمپوں میں وطن اور رشتہ داروں سے دوری کا دُکھ جھیل رہا ہے۔ سراپا انتظار بنا ہوا ہے۔ جنگی قیدیوں کی بیویاں جب ٹیلی ویژن یا اخباری نمائندوں کے سامنے آتی ہیں تو ان کے حزن و ملال میں ڈوبے ہوئے چہرے ساری داستان بیان کر دیتے ہیں۔

چند ماہ پیشتر اسی طرح اخباری کانفرنس میں ایک جنگی قیدی کی بیوی نے اپنے شوہر کا خط پیش کیا۔ جس میں جنگی کیمپ کے دہشتناک واقعات درج تھے۔

"بھارتی کیمپوں میں ہماری حالت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگر کیڑے کو مار دیا جائے تو کوئی شخص ایک لفظ نہیں کہے گا۔ اسی طرح اگر ہمارے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے تو ہمدردی کا ایک لفظ سننے میں نہیں آتا۔ متعدد بار ایسے واقعات میری آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے ہیں۔ کیمپ کی اس بھیانک زندگی میں ہم بتدریج یہ بھی بھولتے جا رہے ہیں کہ خاردار تاروں کے اس پار زندگی کس رنگ میں پھل پھول رہی ہے۔ یہاں زندگی اتنی آہستگی اور خاموشی سے رینگتی ہے کہ موت کا گمان ہوتا ہے۔ یہ ایک وسیع قبرستان ہے جہاں گہری اور منجمد تاریکی میں بے نور آنکھوں والے جسم بلا مقصد اِدھر اُدھر چلتے ہیں۔ میرا بیٹا ارشد کس حال میں ہے، اس کی شرارتیں مجھ تو نہیں گئیں۔ مجھے یاد کر کے روتا تو نہیں۔ مجھے ڈھونڈتا تو ہوگا۔ آخر تم اُسے کیسے بہلاتی پھسلاتی ہوگی۔

کچھ تو بتاؤ کہ اس قبر کی خموشی میں زندگی کا کوئی آثار پیدا ہو جائے۔"

یہ دردناک خط سرحد کے اس پار اور اس پار انتظار کے کربناک لمحوں میں بسر کرنے والی پیاسی روحوں کی داستان المناک ہے۔ انسانیت کے نام لیوا جانے کیوں مہر بہ لب ہیں ان کا دِل اس انسانی تماشہ پر کیوں نہیں پگھلتا۔ اور وہ کیوں نہیں ایک چیخ بن کر عالمی برادری کو جھنجھوڑ دیتے کہ بس ختم کرو اس کھیل کو، انسانیت کی تذلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ نوّے ہزار انسانوں کو پابند سلاسل کر کے انہیں محبت کرنے والے چہروں اور جسموں سے دور کر دیا جائے۔

وقت گذرنے کے ساتھ پاکستان میں بھارت کے اس اقدام کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان کچھ عرصہ پہلے دوستی اور خیر سگالی کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا اب دوبارہ دشمنی اور نفرت کی جگہ بنا رہا ہے۔ برصغیر میں پائیدار امن کا خواب منتشر ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان کا ہر شہری یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا ہے کہ بھارت طاقت کے ذریعے پاکستان کو سرنگوں کرنا چاہتا ہے۔ بھارت کی دوستی اور انسانیت کا دعویٰ محض ڈھونگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے جنگی قیدیوں کی بیگمات بھی اپنے شوہروں کو بھارت کی قید سے چھٹکارہ دلانے کے لئے میدانِ عمل میں نکل آئی ہیں۔ وہ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور یورپ کے دیگر ممالک کا دورہ کر رہی ہیں۔ اور عالمی برادری کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگا رہی ہیں۔

"میں اپنے شوہر کو ہر قیمت پر واپس لاؤں گی۔ بھارت جنگی قیدیوں کو سیاسی مقصد کیلئے استعمال کر رہا ہے۔ سیاسی فیصلے میں سالوں لگیں گے۔ اس وقت تک ہمارے بچے کیا کریں گے۔ ہم لوگ کیا کریں۔؟"

جنگی قیدیوں کی بیگمات نے امریکہ برطانیہ اور فرانس جیسے بڑے ممالک میں پریس کانفرنسوں سے خطاب کیا۔ ممتاز

سیاسی اور ادبی شخصیتوں سے ملاقات کر کے انہیں بھارت اور بنگلہ دیش کی ہٹ دھرمی سے آگاہ کر رہی ہیں۔ انہیں یہ بتا رہی ہیں کہ تم نے ۱۹۴۹ء کے جنیوا کنونشن میں جو رہنما اصول بنائے تھے، بھارت اس کی دھجیاں اُڑا رہا ہے" غیر ملکی دورہ کرنے والی بیگمات کے وفد نے ریڈ کراس کی اُس رپورٹ کو بھی پیش کیا جس میں بھارت پر الزام لگایا ہے کہ کیمپوں میں پاکستانی جنگی قیدیوں کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ انہیں اذیت پہنچائی جا رہی ہے۔"

بین الاقوامی سطح پر حکومت بھی اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ اس مسئلے کو جلد از جلد حل کیا جائے، لیکن بھارت کے رویے کے سامنے ان تمام تر کوششوں کا ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اور کم و بیش ترانوے ہزار پاکستانی فوجی اور شہری اپنے وطن سے دور خاردار تاروں سے گھرے ہوئے گرد آلود بھارتی کیمپوں میں دن کاٹ رہے ہیں۔

ادھر لانس نائیک قربان شاہ کے لڑکے کی طرح ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں اپنے باپوں کی رہائی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے عوام ہی سے نہیں دنیا بھر کے عوام کے سامنے سوالی ہیں کہ ان کے باپوں کو کب چھوڑا جائے گا۔ بھارت اور بنگلہ دیش کا ضمیر کب جاگے گا اور کب عالمی برادری کے دباؤ سے مجبور ہو کر ترانوے ہزار انسانوں کے ارد گرد سے خاردار تاریں ہٹا کر ان سے کہا جائے گا "جاؤ اپنے گھر جاؤ۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اپنے گھر جاؤ۔ تمہارے بچے، تمہاری بیویاں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ اُنہیں دلاسہ دو اور ایک نئی زندگی کا آغاز کر دو۔"

بھارت کو آج نہیں تو کل جنگی قیدیوں کو رہا کرنا پڑے گا۔ وہ زیادہ عرصے تک پاکستانی جنگی قیدیوں کی کفالت نہیں کر سکتا۔ حفاظتی اقدامات پر الگ سے روپے برباد ہو رہے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر علیحدہ رسوائی ہو رہی ہے۔ ان تمام حالات کی روشنی میں اُسے جلد از جلد ایک فیصلے پر پہنچنا ہے۔ اگر بھارت کے حکمران جنگی قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ اس مرحلے پر کر دیں تو یقیناً یہ بات ان کے حق میں جائے گی۔ اس کے علاوہ دونوں بلکہ تینوں ملکوں کے درمیان حالات معمول پر لانے میں بڑی مدد ملے گی۔ اُلجھے ہوئے سیاسی مسائل کے حل کی راہیں نکل آئیں گی۔ اس کے برعکس اگر بھارت نے دھونس اور دھاندلی کا سلسلہ ختم نہ کیا اور زبردستی کوئی سیاسی تصفیہ مسلط کرنے کی کوشش کی تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ عوام کسی سودے بازی کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ نہ ہی وہ کوئی مسلط کردہ فیصلہ قبول کریں گے۔"

یوسف راحت

پرولتاری

رقص کرتی مشینوں کا گھنگھرو تھا میں
دوڑتے وقت کے پاؤں کی دھول تھا
آپ کی کھیتیوں میں جو کھِلا گیا
شاخِ انسانیت کا میں وہ پھول تھا
آپ کی سب مِلوں میں مرا خون تھا
آپ کی راحتیں سب مرے دم سے تھیں
اور میں خود ہمیشہ بھٹکتا رہا وقت کی دھند میں
وحشت ہی وحشت تھا زندگی کا سفر
آگ ہی آگ تھی ہاں مری زندگی
خون روتا رہا، اشک پیتا رہا
راہبر، رہنما تھا، نہ آیا کوئی
وقت کے تیز دھارے میں بہتا گیا
خود ہی ڈوبا گیا، اور ابھرتا رہا
پھر سسکتی ہوئی وہ مری زندگی
غم کے احساس سے ایک شعلہ بنی
اور پھر اِک نیا انقلاب آگیا
رقص کرتی مشینوں پہ قابض تھا میں
دوڑتے وقت کی باگ ہاتھوں میں تھی

افسانہ

کچل دو

ریاض اقبال لودھی



اسٹیشن کی سُرخ پتھروں والی پُرشکوہ عمارت سے باہر نکلتے ہی اس پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ فلک بوس شاندار عمارتیں، شیشوں کے پیچھے جگمگاتی بڑی بڑی دکانیں، صاف و شفاف اور کشادہ سڑکیں اتنی روشن کہ آئینہ دیکھ لے تو شرما کر ٹوٹ جائے۔ اور ان پر محوِ خرام شہر کے ترقی یافتہ لوگ، جو بڑی نفاست اور احتیاط سے قدم اٹھا رہے تھے۔ انکے بھڑکیلے لباس سے یوڈی کلون کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ شہر کی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا پھٹا پُرانا، گرد آلود جوتا اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔ اور وہ ننگے پاؤں سڑک پر چل رہا تھا۔ اسے اک عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

چوراہے پر جلتی بجھتی روشنیاں اسے بڑی بھلی لگیں۔ وہ مقناطیسی کشش سے کھنچتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔ وہ کافی دیر تک سانس روکے ان روشنیوں کا تماشہ دیکھتا رہا۔ اس کھیل سے اکتا کر وہ سڑک کی دوسری جانب چل دیا۔ ابھی وہ سڑک کے عین وسط میں ہی تھا کہ ایک شیورلیٹ اس کو کچلتی ہوئی آگے نکل گئی۔ سڑک خون میں ڈوب گئی تھی

راہ گیر ہجوم کی صورت میں اس کی لاش کے اردگرد کھڑے تھے۔ ہجوم دائرے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اور اس کی لاش نقطے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ مشیتِ ایزدی یہی تھی۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ایک چگی داڑھی والے شخص نے افسوس کا اظہار کیا۔

"بَنَ دیہاتی تھا بے چارہ، ایک اور آواز ابھری۔

دیہاتی نہیں انسان کہو جو سرمایہ داری کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یہ سرخ رنگ اِک دن ضرور رنگ لائے گا۔ ایک نوجوان جذباتی انداز میں چیخا۔

گاڑی والے کو پکڑو نمبر نوٹ کرو۔ مختلف آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ابھریں۔

ہجوم کی نگاہیں لاش سے پھسل کر دور جاتی گاڑی پر مرکوز ہو گئیں۔ سیاہ شورلیٹ دور نکل چکی تھی لیکن گاڑی کے عقبی حصے پر لکھے حروف صاف دکھائی دے رہے تھے، "کچل دو"

افسانہ

مقصود ثاقب

طلوع

"اُف کتنا اندھیرا چھا رہا ہے۔ مجھے تو اس میں اپنا انگ انگ بجھتا محسوس ہو رہا ہے۔" کھلے آسمان پر چمکتے ہوئے ایک چھوٹے ستارے نے دوسرے بڑے ستارے سے کہا بڑے ستارے نے دور سے اُٹھتی ہوئی اندھیری گھٹا کو گھورتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"حوصلہ نہ ہارو، اپنی جگہ جمے رہو۔ نئی گھٹا اُٹھ رہی ہے۔"

چھوٹا ستارہ دوبارہ جی کڑا کر کے چمکنے لگا۔ آسمان پر ان دو ستاروں کے سوا سارے ستارے اندھیرے میں ڈوب چکے تھے۔ تاریکی سمندر کی بھیانک لہروں کی طرح بار بار ان سے ٹکرا کر پھیل رہی تھی۔ لیکن یہ دونوں مونگے کی چٹانوں کی طرح اپنی اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ اندھیرا اپنی پے در پے ناکامیوں سے سٹپٹا کر اب پھر نئے سرے سے اپنی تاریکیوں کو جمع کر رہا تھا، کیونکہ وہ جلد از جلد ان دو ستاروں کو سیاہ کر دینا چاہتا تھا، جن کی چمک سے اس کی سیاہ روح میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ بڑا ستارہ دور اکٹھے ہوتے انہی اندھیروں کا منتظر تھا۔ جوش سے اس کا جسم گرم تھا۔

"کامریڈ۔ کامریڈ!" چھوٹے ستارے نے ایک بار پھر بڑے ستارے کو لڑکھڑاتے سانس میں پکارا۔

بڑے ستارے نے ایک لمحہ کے لئے اندھیرے سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔

"کیا ہے"؟

"کامریڈ! افسوس صد افسوس میں اندھیرے کیخلاف مکمل فتح حاصل ہونے سے پہلے تمہارا ساتھ چھوڑ رہا ہوں میں کیا کروں؟ میرا وجود راکھ ہو ہو کر جھڑ رہا ہے۔"

"اوہ ایسے نہ کہو۔ بس تھوڑی دیر اور انتظار کرو۔"

"نہیں کامریڈ نہیں۔ تم میری پھیکی پھیکی روشنی نہیں دیکھ رہے۔"

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں

علاّمہ اقبال کی برسی پر

جناب "علی عباس جلالپوری اردو ادب کے مشہور محقق اور نقاد ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ کے متعلق بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ "اقبال کا علم الکلام" ان کی مشہور کتاب ہے۔ مندرجہ ذیل مضمون میں جناب محمد کاظم نے اس کتاب کے مضامین کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ہم یہ مضمون ماہنامہ "فنون" لاہور کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ ——— (ادارہ)



اقبال کا علم الکلام

محمد کاظم

پہلے سے ایک عقیدہ رکھتے ہوئے زندگی اور کائنات کے بارے میں غور و فکر کرنا اور اس عقیدے کے حق میں عقلی دلائل بہم پہنچانا "علم کلام" کی تعریف میں آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرے روّیے کا نام فلسفہ ہے جس میں انسان کسی خاص عقیدے کا پابند ہو کر نہیں بلکہ آزاد اور خالی الذہن ہو کر اس کارخانۂ وجود میں سوچ بچار کرتا اور اپنا نظامِ فکر مرتب کرتا ہے۔ یہ دو روّیے ہمیشہ سے ایک دوسرے کے حریف اور مد مقابل چلے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے علم کلام کو بھی اتنا ہی قدیم ہونا چاہیئے جتنا کہ خود مذہبی عقیدہ اور فلسفہ قدیم ہیں۔ لیکن اس علم کی باضابطہ صورت ہمیں سکندریہ کے یہودی فلو کے یہاں ملتی ہے، اگرچہ اس کا نام اُس زمانے میں کچھ اور ہی ہے۔ اس کے لئے "علم کلام" کی اصطلاح بہت بعد میں مسلمانوں نے وضع کی، اور بقول شہرستانی یہ معتزلہ تھے جنہوں نے مامون الرشید کے زمانے میں اس علم کو باقاعدہ "علم کلام" کا نام دیا۔ عقائد و ایمانیات پر بحث و استدلال اس سے پہلے بھی ہوتا آیا تھا لیکن اہل علم اُسے دوسرے ناموں سے پکارتے تھے۔ مثلاً امام ابوحنیفہ نے عقائد کے بارے میں اپنی کتاب کا نام الفقہ الاکبر رکھا تھا اس زمانے میں کلامی مسائل پر بحث کرنے کو عموماً الفقہ فی الدین کہا جاتا تھا، جس کے معنی ہیں: دین میں گہری سوجھ بوجھ پیدا کرنا!

مسلمانوں میں علمِ کلام کی بنا مذہبی فرقوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے پڑی۔ اسلام جب تک جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں رہا، لوگوں نے اس کے عقائد و ایمانیات کو بے چون وچرا تسلیم کیا، اس لئے کہ عربوں کا مزاج منطقی سے زیادہ جذباتی تھا۔ بعد میں جب اسلام ہر طرف پھیلنا شروع ہوا اور ایرانی، یونانی، قبطی وغیرہ قومیں اس کے حلقۂ اثر میں آئیں تو عقائد کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اس کی وجہ کچھ تو عجمی قوموں کا ذوق تحیّن تھا اور کچھ یہ کہ ان کے ہاں صفاتِ الٰہی، قضاؤ قدر اور جزا و سزا جیسے مسائل کے بارے میں پہلے سے عقائد و نظریات موجود تھے، اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے ان قدیم نظریات کی آمیزش اسلامی عقائد کے ساتھ کرنے لگے۔ پھر بعض مسائل ایسے تھے جن کے بارے میں اہل اسلام کے ہاں ہمیشہ سے دو رائیں پائی گئیں، اور ان دونوں کی سند خود کتاب اللہ سے ماخوذ ہوتی تھی۔ مثلاً یہ مسئلہ کہ انسان اس دنیا میں اپنے اعمال کا آپ مختار ہے یا نہیں؟ اس بارے میں قرآن کی بعض آیات سے یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کا مختار ہے، اور بعض

اقبال نے بعض جگہ مغربی فلسفے کی تقلید کی ہے

دوسری آیات صراحت کرتی ہیں کہ انسان کا عمل منشائے الٰہی کے تابع ہے ---- عقائد کے بارے میں جب اس طرح بحث و مباحثے کی روش چلی، تو ہر چھوٹے بڑے مسئلے پر اختلافات پیدا ہوئے اور ان اختلافات کی بنیاد پر مشبہہ، جبریہ، قدریہ، مرجیہ جیسے مذہبی فرقے وجود میں آئے، اور اُن کے درمیان آئے دن مناظروں کی وجہ سے علم کلام کو فروغ حاصل ہوا۔

کلامی مسائل پر وجود میں آنے والے مذہبی فرقوں میں دو گروہ آگے چل کر اہم تر اور اپنے اثر کے اعتبار سے دور رس ثابت ہوئے۔ ان میں سے ایک گروہ جو پہلے قدریہ کہلاتا تھا اور بعد میں معتزلہ کے نام سے مشہور ہوا عقائد میں غور و فکر کو لازم سمجھتا تھا، اور عقل کو نقل پر ترجیح دیتا تھا اور دوسرا گروہ اشاعرہ کا تھا جو عقائد کو بے چون وچرا قبول کرنے اور نقل کو ہر حال میں عقل پر فضیلت دینے کا قائل تھا۔ ان دو گروہوں کے درمیان صفاتِ الٰہی کے بارے میں ایسے بنیادی اختلافات تھے کہ ان کی وجہ سے ایک معتزلی اور ایک اشعری مسلمان کے رویہ میں تقریباً اتنا ہی فرق پایا جانا چاہیے جتنا کہ دو مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر معتزلہ کہتے تھے کہ خدا کی تمام باتیں مصلحت پر مبنی ہیں اور اس کا کوئی حکم بھی حکمت سے

> ”علمِ کلام“ کی بنیاد مذہبی فرقوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے پڑی

خالی نہیں ہوتا۔ اشاعرہ کہتے تھے کہ خدا کے احکام کا مصلحت پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ معتزلہ کہتے تھے کہ عدل و انصاف خدا کی فطرت ہے اور اس سے کبھی ناانصافی کا ظہور نہیں ہو سکتا۔ اشاعرہ کا ایمان تھا کہ خدا اگر چاہے تو نیک آدمیوں کو بھی بے وجہ سزا دے سکتا ہے اور یہ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ معتزلہ کا عقیدہ تھا کہ خدا نے اشیاء میں خواص اور تاثیر رکھی ہے، اور شارع اسی چیز کو اچھا کہتا ہے جو پہلے سے اچھی ہوتی ہے۔ اشاعرہ کے نزدیک اشیاء کی کوئی مستقل خاصیت اور تاثیر نہیں، شارع جس چیز کو اچھا کہہ دے وہ اچھی ہو جاتی ہے اور جسے بُرا کہہ دے وہ بُری ہو جاتی ہے۔ معتزلہ کہتے تھے کہ خدا نے انسان کو اپنے افعال کا مختار اور ذمہ دار بنایا ہے۔ اشاعرہ کہتے تھے کہ انسان کو اپنے افعال پر قدرت نہیں، خدا ہی انسان سے نیکی بھی کراتا ہے اور بدی بھی! ---- ان چند مسائل سے ہی عیاں ہو جاتا ہے کہ معتزلہ دین کے دائرے میں رہتے ہوئے عقل و خرد کی آزادی کے علمبردار تھے، اور اسلامی عقائد کی تشریح اس طور پر کرتے تھے کہ وہ عقل و منطق کی کسوٹی پر بھی پورے اتریں اور انسان انہیں محض جذباتی سطح پر نہیں بلکہ ذہن و فکر کی طمانیت کے ساتھ قبول کرے!

بنوامیہ کے دور تک علم کلام کا استعمال تمام تر مذہبی فرقوں کی باہمی نزاع و پیکار تک محدود رہا۔ عباسیوں کے عہد میں جب لوگوں کو زیادہ مذہبی آزادی ملی، تو مجوسی، یہودی، عیسائی وغیرہ قوموں کی طرف سے اسلامی عقائد کے بارے میں اعلانیہ شکوک و اعتراضات اُٹھائے جانے لگے۔ اس کے ساتھ پہلوی زبان سے جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں، ان کی اشاعت سے لوگوں میں الحاد کے جراثیم پھیلنے لگے۔ اس رجحان کو روکنے کے لئے خود حکومت کی طرف سے علمائے کلام کو یہ فریضہ سپرد ہوا کہ وہ مذہب اسلام کی مدافعت اور اس کی سچائی اور برتری کے اثبات میں کتابیں لکھیں۔ اس طرح خلفاء کی سرپرستی میں علم کلام کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، اور وہ دوسرے مذاہب اور فلسفہ و الحاد کے مقابلے میں عقل و منطق کے ہتھیاروں کے ساتھ صف آرا ہوا۔ کوئی شک نہیں کہ یہ علم کلام کا عہد زریں تھا، اور اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس عہد میں ہمیں معتزلہ ہی سارے فکری منظر پر چھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور عباسی دور کے علم کلام کی تاریخ ایک طرح سے معتزلہ ہی کی تاریخ لگتی ہے۔

یہ علم کلام کی عقلی شاخ تھی۔ اس علم کی دوسری شاخ کا تعلق روایت سے تھا۔ اس طریقے کی بنیاد تیسری صدی ہجری کے آخر میں امام اشعری نے رکھی اور باقلانی اور امام الحرمین سے ہوتا ہوا یہ علم کلام امام غزالی تک پہنچا۔ امام غزالی سے پہلے اس نقلی علم کلام کو فلسفہ سے الگ رکھا گیا تھا، اور محدثین اور فقہاء منطق و فلسفہ سے اس طرح اجتناب کرتے تھے جیسے یہ کوئی شیطانی علم ہو۔ غزالی کی بدولت فلسفے کو قبولیت کی سند ملی، اور پہلی بار مذہب و فلسفہ کی تعلیم ساتھ ساتھ ہونے لگی، چنانچہ امام غزالی اور ان کے بعد رازی نے فلسفہ کے رد میں مستقل کتابیں لکھیں ---- لیکن غزالی بعد میں تصوف کی راہوں میں گم ہو گئے اور بقول سید علی عباس جلالپوری "انہوں نے تصوف کے مسائل کو شرعی اور فقہی مسائل میں ایسا مخلوط کر دیا کہ آج تک مسلمان اس سے گلو خلاصی حاصل نہیں کر سکے" اسے محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اشاعرہ کے علم کلام کو تاریخ کے اُس دور میں فروغ حاصل ہوا جب خلافتِ اسلامیہ کا تنزل شروع ہو چکا تھا، اور رہی سہی کسر بعد میں فتنۂ تاتار نے پوری کر دی تھی۔ ایسے حالات میں یہ اشاعرہ کی جبریت تھی جس نے تقدیر پرستی کو دنیائے اسلام میں عام کیا، اور مسلمانوں کو ذلت و ادبار کی حالت میں بھی مطمئن اور راضی بہ رضا رہنا سکھایا۔ نیز ان کے اندر یہ خیالات پھیلائے کہ بادشاہ خدا کا سایہ ہے اس کی اطاعت کے مترادف ہے۔ چنانچہ ترکوں اور سلجوقیوں کے عہد میں فکر و نظر کی آزادی کا سورج غروب ہوا، اور دنیائے اسلام پر ذہنی جمود اور اندھی تقلید کی ایک لمبی اندھیری رات چھا گئی!

یہ علم کلام کے عہد ماضی کا ایک سرسری اور نامکمل سا جائزہ تھا۔ علم کلام کا نیا دور انیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے، اور ہندوستان میں اس زمانے میں سر سید احمد خاں اور سید امیر علی کے خیالات میں ہمیں آزادیٔ فکر و نظر کی وہ لَو دکھائی دیتی ہے جو معتزلہ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ یہ اصحاب مشرقی و مغربی علوم کے جامع اور اسلام اور اقوامِ عالم کی تمدنی روایات سے باخبر تھے۔ چنانچہ مذہب اور اس کے عقائد کے بارے میں انہوں نے عقلی اور منطقی رویہ اختیار کیا، اور نئے زمانے کی ضروریات کے مطابق ایک نیا علم کلام ترتیب دینے کی کوشش کی۔ ان کے مقابلے میں راسخ الاعتقاد (ORTHODOX) اور روایت پرست لوگوں کا گروہ تھا۔ جن میں مولانا ابوالکلام آزاد اور اکبر الٰہ آبادی کے ساتھ مولانا شبلی بھی شامل تھے۔ حالانکہ شبلی ایک زمانے میں سر سید سے متاثر تھے، اور ایک طویل عرصہ ان کی صحبت میں رہتے رہتے اعتزال کی طرف مائل ہو گئے تھے۔

یہ وہ پس منظر ہے جہاں علامہ اقبال اپنا علم کلام لے کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اپنے پیشرو اہل فکر کی طرح انہیں بھی اس امر کا شدید احساس تھا کہ دورِ حاضر کی نئی قدروں اور جدید تقاضوں کے مقابلے میں اسلامی عقائد کو ایک نئے انداز سے سمجھنے اور پیش کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ اس کے لئے انہوں نے اپنی نثر اور نظم دونوں کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور ایک طرف اپنے خطبات میں، اور دوسری طرف اپنی فارسی اور اردو شاعری میں کلامی مسائل پر اپنے افکار و آراء پیش کئے!

سید علی عباس جلال پوری نے جو، علاوہ اور بہت کچھ ہونے کے، ملک کے ایک مانے ہوئے محقق و مفکر ہیں، اب سے دس بارہ سال پہلے اقبال کے علم کلام پر اردو کے ماہنامہ "ادبی دنیا"



میں ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا۔ کتاب زیرِ نظر میں انہوں نے ان مضامین کو یک جا کر دیا ہے۔ ان مضامین میں علامہ کے علمِ کلام کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ بحث و تجزیہ کا انداز خالصۃً علمی، سنجیدہ اور دیانت دارانہ ہے۔ جن لوگوں کو سید علی عباس جلال پوری کی چیزیں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ جس چیز کو وہ صحیح سمجھتے ہیں اسے برملا کہتے ہیں اور دلیل کے ساتھ کہتے ہیں، چاہے اس کی زد کتنی ہی بڑی شخصیت پر جا کے پڑتی ہو۔ اس لئے بعض لوگوں کو سید صاحب کی اَرا پسند نہیں آتیں۔ وہ ان کی تحریروں سے جزبز ہوتے ہیں، انہیں بیٹھ پیچھے کوستے بھی ہوں گے، لیکن ان باتوں کا دلیل کے ساتھ جواب دینا، جو ایک صحیح اور شریفانہ رویّہ ہے کم ہی کسی سے بن پڑتا ہے۔ اور مجھے ان سے اختلاف کرنے والوں کی کوئی ایسی چیز پڑھنے کا اب تک اتفاق، نہیں ہوا، جس میں انہوں نے سید صاحب کے ساتھ خالص علمی انداز میں بحث کی ہو ——— اس کتاب میں بھی سید علی عباس نے اقبال کے علمِ کلام کے بعض ایسے پہلو بے نقاب کئے ہیں جو قرآنی تعلیمات اور اسلامی روایات سے مطابقت نہیں رکھتے، یا جن میں اُنہوں نے واضح طور پر مغربی فلاسفہ کی تقلید کی ہے۔ یہ چیز بہت سے عقیدت مندانِ اقبال کو گراں گذرے گی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ سید صاحب نے یہ نتائج خود علامہ کی تحریروں اور ان کے اشعار سے مرتب کئے ہیں اور ان کو جھٹلانے کے معنی خود اقبال کو جھٹلانے کے ہوں گے۔ لیکن اقبال کے تنقیدی جائزے کا یہ مطلب لینا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ سید علی عباس شاعر اقبال کی عظمت کے قائل نہیں ہیں۔ اس کے برعکس وہ اقبال کی شاعری کے بہت پرجوش مداح ہیں، اور میر تقی میر، مرزا غالب اور میر انیس کے ساتھ انہیں اردو شاعری کے عناصرِ اربعہ میں شمار کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اب وقت ہے کہ ہم مشاہیر پرستی کا یہ بھونڈا رویّہ ترک کر دیں۔ ہم اپنے مرنے والے عظماء اور رہنماؤں کو عقیدت کے ایسے بلند مقام پر جا کے بٹھاتے ہیں کہ وہ ماورائی مخلوق بن جاتے ہیں، اور ان کے ساتھ ہمارا کوئی انسانی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ ان عظماء کو ان کے اصل ناموں کے ساتھ پکارنا بھی گستاخی پر محمول ہوتا ہے۔ قائدِ اعظم کے لئے آج محمد علی جناح کا نام استعمال کرنا اپنے اوپر بے ادبی اور پاکستان دشمنی کا الزام لینا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میرے لئے جو جاذبیت اور اپنائیت انسان محمد علی جناح میں ہے وہ اوتار قائدِ اعظم میں نہیں، محمد علی جناح میرا ہم نوع ہے، میری زمین کا باشندہ ہے۔ اس کے مقابلے میں حضرت قائدِ اعظم مجھے دور بادلوں میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستانی پرچم ہاتھ میں لئے (جیسا کہ انہیں ہمارے بچوں کی عجیب و غریب نصابی کتابوں میں دکھایا جاتا ہے) اور اس کا خمیازہ ہمیں یوں بھگتنا پڑ رہا ہے کہ اب محمد علی جناح کے بارے میں ہمارے ہاں کبھی کوئی دھڑکتی اور سانس لیتی ہوئی کتاب نہیں لکھی جائے گی، البتہ فوق البشر قائدِ اعظم کے متعلق بے روح کتابیں ہمیشہ لکھی جاتی رہیں گی، اور قائدِ اعظم ہماری پہنچ سے اتنی ہی دور رہیں گے جتنے وہ اب ہیں!

اس کتاب میں فاضل مصنف نے سب سے پہلے ایک فلسفی اور متکلم کا فرق بتاتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ علامہ اقبالؔ اصل میں ایک متکلم تھے، فلسفی نہیں تھے۔ آگے چل کر انہوں نے علمِ کلام کی ایک مختصر تاریخ بیان کی ہے، اور اس کے بعد مختلف کلامی مسائل پر الگ الگ باب باندھ کر ان کے تحت اقبالؔ کے علمِ کلام کا ایک تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

علمِ کلام کا بنیادی اور اوّلین مسئلہ خدا کی ذات اور اُس کی صفات کا ہے۔ اس لئے پہلے دو ابواب میں اقبال کے تصورِ ہمیشہ شخصی اور ماورائی تصوّرِ ذاتِ باری کو توحید کا لازمہ سمجھتے رہے لیکن بعد میں جب یونانی فلسفے کے ساتھ فلاطینوس کا نظریۂ اشراق یونانی دنیا میں پہنچا تو مسلمان صوفیہ نے اسے اسی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا، جیسے وہ اس کی تلاش میں تھے اور ابن سینا اور اخوان الصفا سے لے کر سب بڑے صوفیہ نے اسے اپنی فکر اور عملی روّیے کی بنیاد بنایا۔ سید علی عباس صاحب نے علامہ اقبال کی تحریروں اور شعروں اور خطبوں کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علامہ اقبال کا تصورِ ذاتِ باری مختلف زمانوں میں مختلف رہا ہے "وہ اپنی شاعری کے پہلے دور میں وحدتِ وجود کے شارح اور نو فلاطونی صوفی تھے" چنانچہ جس زمانے میں وہ انگلستان میں مقیم تھے وہ مجلسوں میں اکثر حافظ شیرازی کے شعر پڑھا کرتے تھے۔ بعد میں جب انہوں نے ملتِ اسلامیہ کے احیاء کا بیڑا اٹھایا تو وہ ہمہ اوست کی مخالفت کرنے لگے، اور ابنِ عربی کی تعلیمات کو کفر و زندقہ ٹھہرایا اور اسی حافظؔ شیرازی کے کہا کہ ؏

جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

اس ضمن میں ایک عجیب اور متناقض PARA DO-XICAL صورتِ حال جس کی طرف سید صاحب نے توجہ دلائی ہے، یہ ہے کہ اقبال ایک طرف تو ابنِ عربیؔ کی تعلیمات کو گمراہ کن قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ مولانا جلال الدین رومی کو جو ابنِ عربی کے ایک شاگرد کے شاگرد اور وحدتِ وجود کے ایک اہم ترجمان سمجھے جاتے ہیں، اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں اور ان کی مثنوی کو "قرآن در زبان پہلوی" کا درجہ دیتے ہیں ——— آخر میں جا کر علامہ نے ایک بار پھر اپنا نقطۂ نظر تبدیل کیا، اور جب اپنے خطبات رقم کرنے لگے تو وجودی صوفیہ کی الہیات کو انہوں نے قبول کر لیا اور یہی

ہم اپنے رہنماؤں کو ماورائی مخلوق بنا دیتے ہیں

ذاتِ باری اور ان کے نظریۂ وحدتِ وجود سے بحث کی گئی ہے، ذاتِ باری کے متعلق ہمیشہ سے دو نظریے پائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کائنات سے ماوراء ہے اور دوسرا یہ کہ وہ کائنات میں جاری اور ساری ہے۔ اور کائنات میں جو کچھ بھی ہے اسی کا پرتو ہے۔ پہلا نظریہ سامی اقوام کا ہے اور ان کے مختلف ادیان (یہودیت عیسائیت، اسلام ابھی اسی پر قائم ہیں۔ یہ ماورائی نظریہ کہلاتا ہے اور ہمہ از وست اور وحدتِ شہود کے پیچھے بھی یہی نظریہ کار فرما ہے۔ دوسرا نظریہ جو سریانی کہلاتا ہے۔ ہندوؤں، یونانیوں اور روم کے رواقی اور اشراقی فلسفیوں کے ہاں مروج رہا ہے اور ہمہ اوست اور وحدتِ وجود اس کے دوسرے نام ہیں۔ اہلِ اسلام نہیں بلکہ مغربی فلسفی برگساں سے متاثر ہو کر ذاتِ خداوندی کے ارتقائی سریان کے قائل ہوئے جس کا مطلب یہ کہ ذاتِ خداوندی نہ صرف کائنات میں جاری و ساری ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خود بھی ارتقاء کی منزل طے کر رہی ہے اور ایک تخلیقِ مسلسل کے عمل میں سرگرم ہے چنانچہ اپنے ایک خطبے میں کہتے ہیں:

"اس (یعنی حقیقی انا) کو بے تغیر ٹھہرایا گیا تو ہم اس کا تصور محض ایک تعطل، ایک بے مقصد اور بے حرکت بے رنگی یا ایک مطلق لاشے ہی کے طور پر کر سکیں گے۔ در اصل ایک ایسے انا کے لئے، جو سر تا سر خلاق ہے۔ تغیر کے معنی نقص کے نہیں ہو سکتے۔"

اس کے بعد کا باب "اقبال اور تقابلِ عقل و وجدان" پر ہے

عقل اور وجدان یا دوسرے الفاظ میں فکر اور جذبے کی کشمکش بہت قدیم ہے۔ سید صاحب اس کشمکش کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہوئے جب اقبال تک آتے ہیں تو برگساں کی طرح انہیں بھی عقل و خرد کی تنقیص کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ع

خرد بیگانۂ ذوقِ یقیں است!

یہاں سید صاحب علامہ اقبال سے اختلاف کرتے ہوئے عقل و خرد کی اہمیت اور وجدان اور جذبے پر اس کی برتری کے حق میں فلسفہ اور تاریخ اور عمرانیات سے دلائل لاتے ہیں۔ بارہ نکات کے تحت جمع کئے گئے ان کے یہ دلائل بہت وزنی ہیں۔ اور اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے مقابلے میں جبلت و وجدان کے حق میں بھی کوئی اتنے ہی دلائل لے آتے، لیکن مسئلے کے آخری تجزیے میں ہم ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اگر ہمیں علم و تمدن اور تہذیب کی جانب پیش قدمی کرنی ہے تو ہمیں عقل و خرد کو اس کے تمام امکانات کے ساتھ بروئے کار لانا ہوگا، اور جذبہ و وجدان پر اس کی بالادستی تسلیم کرنی ہوگی۔ جذبہ و وجدان بغیر عقل و فکر کی رہنمائی کے ہمیں کسی منزل پر نہیں پہنچائیں گے۔

اس سے اگلے دو باب "اقبال کے روحانی افکار" اور "تاویلاتِ اقبال" کے نام سے ہیں۔ تاویلات میں سید صاحب نے اقبال کے نظریۂ خودی، نظریۂ زماں اور حیات بعد ممات کے بارے میں ان کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے، اور مغربی فلاسفہ کے ہاں انکے ماخذ تلاش کئے ہیں۔ سید صاحب کی تحقیق کے مطابق اقبال کا نظریۂ خودی تمام و کمال نٹشے سے ماخوذ ہے، اور نظریۂ زماں انہوں نے برگساں سے لیا ہے۔ حیات بعد ممات کے باب میں بھی وہ نٹشے سے متاثر ہیں اور میرے لیے یہ ایک "اطلاع" سے کم نہیں کہ اس جرمن فلسفی کے تتبع میں اقبال بھی آخرت کی زندگی کو مشروط قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جن اشخاص کی خودیاں فطری ماحول کے خلاف کشمکش کرنے اور عزائم و مقاصد کی تخلیق و تکمیل سے مضبوط ہو جائیں گی، وہی بقائے دوام اور بعث و حشر کی حق دار ہوں گی۔ باقی سب جسم کی موت کے ساتھ فنا ہو جائیں گی۔ یہ ایک چونکا دینے والی بات ہے۔ اس لئے کہ اس کی زد براہِ راست اسلام کے نظریۂ معاد و بقا پر پڑتی ہے، جس کی رو سے ہر فردِ انسانی حشر کے روز پھر سے زندہ ہو کر خدا کے رُوبرو پیش ہوگا، اور فیصلہ خداوندی کے مطابق جنت یا جہنم اس کا ابدی و سرمدی ٹھکانہ بنے گا۔ اس کے مقابلے میں اقبال اپنے خطبات و مکاتیب میں واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ:

"بقائے دوام انسان کا حق نہیں۔ اس کے حصول کا دارو مدار ہماری مسلسل جد و جہد پر ہے۔"

اور یہ کہ:

"میرے نزدیک حیات بعد الممات انسانی کوشش اور فضلِ الٰہی پر منحصر ہے۔ اور میرے نزدیک کوئی شخص ابدی موت کا خواہش مند ہو تو وہ اسے حاصل کر سکتا ہے۔"

اقبال کا یہ نظریہ اسلامی عقیدے سے میل کھاتا ہو یا نہ، ایک لحاظ سے خوش آئند ضرور ہے۔ اس لئے کہ موت کے بعد دوسری زندگی کا جو نقشہ ہمارے سامنے کھینچا جاتا ہے اور وہاں جنت الفردوس میں آباد ہونے کے لئے جس قسم کے لوگ یہاں کمر باندھے بیٹھے ہیں، اس کے پیشِ نظر ہم میں سے بہت سے عافیت پسند لوگ، اور ان میں ایک میں بھی ہوں، موت کی ابدی نیند میں پڑے رہنا ہی پسند کریں گے۔ ہمیں اقبال کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ہمیں جنت اور جہنم کی ایک اکتا دینے والی لامتناہیت (INFINITY) کے علاوہ ایک تیسرے امکان سے بھی آگاہ کیا ہے، جس میں ہم مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے، اور "جینے" کی مصیبت سے ہمیشہ کے لئے نجات پا جائیں گے۔

"علم کلام کے اثرات و نتائج" اور "دنیائے اسلام میں خرد افروزی کی ضرورت" کے دو باب اس کتاب کی جان ہیں۔ ان میں سید صاحب نے علم کلام کو مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے انہیں یہ نصیحت کی ہے کہ وہ پدرم سلطان بود کے پندارِ بے جا کو چھوڑ کر ایک محقق اور طالب علم کے سے انکسار اور تجسس و انہماک کے ساتھ نظری و تجربی سائنس اور جدید فلسفے کی تحصیل کریں، اور صدیوں کے عقلی و ذہنی جمود کو جھٹک کر دنیائے علم و عمل میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کریں۔ ان دونوں ابواب میں سید صاحب کا لب و لہجہ کچھ زیادہ بیباک اور تیکھا اور نوکیلا ہے۔ وہ مسلمانوں کے اس ماضی سے بہت نالاں ہیں، جس میں مذہب کے نام پر خرد دشمنی کی روایت کو آگے بڑھایا گیا۔ اس سلسلے میں وہ امام غزالی، مولانا جلال الدین رومی اور مولانا مودودی کے افکار کا ایک تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ مولانا مودودی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ وہ فلسفہ اور سائنس کو بھی علم کلام کی کنیز بنانا چاہتے ہیں۔ اور پھر سے مذہب پر علوم کی بنیاد رکھنے کا وہ تجربہ کرنا چاہتے ہیں، جو اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے اور ناکام رہا ہے۔ مولانا مودودی نے اپنے مقالات میں ایک جگہ اس امر کو لازم قرار دیا تھا کہ:

"مسلمانوں میں ایسے مفکر و محقق پیدا ہوں جو قرآن کے بتائے ہوئے طریقِ فکر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نظامِ فلسفہ کی بنیاد رکھیں۔ ایک نئی حکمتِ طبیعی (نیچرل سائنس) کی عمارت اُٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اُٹھے۔ اور اس جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت سے اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائیں اور دنیا میں مغرب کی مادی تہذیب کی بجائے مقامی تہذیب جلوہ گر ہو۔"

سید علی عباس مولانا مودودی کا یہ اقتباس نقل کر کے ان سے پوچھتے ہیں کہ پھر وہ بسم اللہ کیوں نہیں کرتے اور کس کے لئے انہوں نے اس کام کو ملتوی کر رکھا ہے۔ اُوپر کی یہ تحریر دراصل مولانا مودودی کے اوائل زمانے کی ہے، جب وہ ایک برجِ عاج (IVORYTOWER) میں بیٹھ کر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ انہیں شاید ان دنوں یہ گمان تھا کہ ان کی اس خطیبانہ تلقین کو سنتے ہی ان کے چند ہم خیال جدید قسم کے 'مولانا' سب کام چھوڑ کر کتب خانوں میں جا بیٹھیں گے۔ اور اس وقت تک باہر نہیں آئیں گے جب تک ان کے ہاتھ میں نیا اسلامی فلسفہ اور دوسرے ہاتھ میں نئی اسلامی سائنس نہیں ہوگی۔ لیکن بُرا ہو حقائق کی دنیا کا! مولانا برج عاج سے اُتر کر نیچے آئے، جماعت بنائی، اور اپنے ہی ORA CLE کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے آپ کو الیکشنوں اور سیاسی بکھیڑوں میں ایسا اُلجھایا کہ آج تک ان سے خلاصی حاصل نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک نیا اسلامی فلسفہ اور نئی اسلامی سائنس تو ایک طرف رہے، پچھلے پچیس برسوں میں وہ اتنے بڑے ملک میں ایک سیدھا سادہ اسلامی مدرسہ بھی قائم نہیں کر سکے، اور مسلمانانِ پاکستان کی ساری نئی نسل کو انھوں نے اُن درس گاہوں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے جو انہیں اپنے برج میں بیٹھے ہوئے قتل گاہیں دکھائی دیتی تھیں۔ حقائق کی دنیا بڑی بے رحم ہوتی ہے۔ جب زندگی کے ازدحام میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے تو قدر و عافیت معلوم ہوتی ہے۔ مولانا وہ اپنا برجِ عاج زمانہ کا ہے کو بھولے ہوں گے! جب نیا اسلامی فلسفہ اور نئی اسلامی سائنس مرتب کرنا اتنا سہل دکھائی دیتا تھا۔

> **وہ اپنی شاعری کے پہلے دور میں وحدتِ وجود کے شارح اور نو فلاطونی صوفی تھے**

باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ فرمائیں

شمیم احمد مدیر روزنامہ "سن" کے نام جنت سے الطاف حسین کا ایک خط

صدر ناصر اور مصطفیٰ زیدی بھی تمہاری شکایت کر رہے ہیں

قارئین کرام! آپ کی دلچسپی کے لئے ہم ماضی قریب کے ممتاز صحافی اور روزنامہ ڈان کے سابق ایڈیٹر جناب الطاف حسین مرحوم کا ایک خط جو انہوں نے جنت سے روزنامہ سن کے ایڈیٹر جناب شمیم احمد کے نام لکھا ہے، شائع کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے جنت سے کون خط یہاں بھیج سکتا ہے۔ یہ خط اگرچہ محض تصورات پر مبنی ہے، لیکن ان حقائق کی ترجمانی ضرور کرتا ہے، جو حال ہی میں روزنامہ سن میں رونما ہوئے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ سن کی انتظامیہ اور اس کے ایڈیٹر نے اپنے محسن صحافیوں اور دوسرے کارکنوں کے ساتھ کیسا بے جا اور افسوس ناک رویہ اختیار کیا۔ صحافیوں اور دوسرے کارکنوں کو غیر قانونی طور پر برطرف کر دیا اور اپنے ظالمانہ رویے کی بنا پر بہتوں کو نوکری چھوڑنے پر مجبور کیا ——— (ادارہ)

عزیزم شمیم احمد۔

جب سے تم نے روزنامہ سن کی ادارت سنبھالی، اس وقت سے تمہیں خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، مگر یہاں جنت میں بھی کوئی لمحہ فرصت کا نہ ملا۔ خدا نے اپنے بندوں کیلئے ایک سے ایک دلچسپی کا سامان مہیا کر رکھا ہے کہ صبح و شام کا یہاں احساس تک نہیں ہوتا۔

بہر حال آمدم بر سر مطلب۔ تمہارا اخبار اکثر و بیشتر نظر سے گزرتا ہے۔ بڑا افسوس ہوتا ہے کہ تم نے میرے ساتھ کام کرنے کے باوجود کچھ حاصل نہ کیا۔ شروع میں تو میں اسے اخبار ہی ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن عطا الصمد، احمد حسین اور اے۔ ٹی چوہدری کی نایاب تحریروں کی وجہ سے ذرا پرچے نے جان پکڑی مگر یکایک پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ٹیوب کی ہوا نکل گئی۔ اخبار میں جو کچھ تھا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور گورنمنٹ کے گزٹ کی طرح یہاں آنے لگا۔ ہر صبح پرچہ دیکھ کر کوفت ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ بند کروا دوں۔ مگر اس فیصلے سے پہلے سوچا کہ اپنے تاثرات تم تک پہنچا دوں۔ صحافی ہوں حق بات کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔ امید ہے تم صاف گوئی پر منہ نہیں بسوروگے۔

میں تمہیں پہلے بھی لکھنے والا تھا کہ زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔ حکومت پر نکتہ چینی کرنا صحافت کا بنیادی اصول ہے۔ مگر تنقید تعمیری ہونی چاہیئے۔ مگر تعمیری نکتہ چینی تو در کنار تم نے تو صحافت اور اخلاقیات کی اس طرح دھجیاں بکھیریں کہ ہم تمام صحافیوں کو یہاں شرم آنے لگی۔ پولیس کی ہڑتال کو اچھالا۔ وزیر کا مذاق اڑایا۔ کوثر نیازی کو نکاح پڑھانے والا "قاضی" اور نہ جانے کیا کیا لکھا۔

یہ لازمی امر تھا کہ اخبار بند کر دیا جائے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے یہ گمان تھا کہ اخبار بحال ہونے پر تم اپنا طرزِ عمل درست نہ کروگے۔ اور اگر ایسا کرنے کو کہا گیا تو تم استعفیٰ دے دوگے۔ یہ شاید میری خوش فہمی تھی۔ تم ایسا بکے کہ ایک مرتبہ پھر صحافت کے زریں اصولوں کو پامال کیا۔

کہاں کوثر نیازی کو گالیاں دی جاتی تھیں اور کہاں اب وزیر اطلاعات کی چھ چھ کالمی تصاویر شائع کی جاتی ہیں۔ ان کے تمام بیانات صفحہ اوّل پر شائع کئے جاتے ہیں۔ نجانے اب تمہیں پی پی پی میں اس قدر اچھائیاں کہاں سے نظر آنے لگیں۔

مجھے یہ بات افسوس کے ساتھ لکھنی پڑتی ہے کہ تم نے اپنی مزدور دشمن پالیسی ابھی تک ترک نہ کی۔ جن مزدوروں نے تمہارا اخبار اور تمہاری کرسی بحال کی، تم نے انہیں سخت ترین سزائیں دیں۔ یہاں تک کہ تم نے کئی کے پیٹ پر لات تک مار دی۔

علاوہ ازیں دوسرے ملز اور فیکٹریوں کے مزدوروں کے ساتھ بھی تمہارا رویہ قابلِ مذمت ہے۔ تم نے ایک مرتبہ شہ سرخی لگائی کہ مزدوروں اور پولیس میں "GUN-BATTLE" ہوئی۔ حالانکہ دوسرے اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں میں ایسا کوئی تاثر نہ تھا۔ اور یہ ہی نہیں مزدوروں کے معاملہ میں ایک اور ناانصافی کی۔ تم نے لکھا کہ لانڈھی میں شہید ہونے والے مزدور پولیس کی گولی کا نشانہ نہیں بنے تھے۔ اور دوسرے پیراگراف میں تم نے ایس۔ پی گوہر زماں کا انٹرویو شائع کر دیا۔ اور مزدوروں کی ایک بات نہ لکھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اخبار پولیس گزٹ ہے۔ مجھے یقین کامل تھا کہ کسی جونیئر رپورٹر نے اس قسم کی رپورٹ لکھی ہو گی مگر پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ تمہاری تحریر تھی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ غلط سلط سرخیاں کون لگاتا ہے۔ مثلاً جب مصر کے صدر جمال ناصر نے رحلت فرمائی تو سن کی سرخی ——— NASSER KILLED BY HEART ATTACK بڑی مضحکہ خیز تھی۔ دو تین دن بعد مصر کے کچھ صحافی حضرات یہی تذکرہ کر بیٹھے۔ اور بات جمال ناصر تک پہنچی۔ اور وہ بھی مجھ پہ طنز کر بیٹھے کہ پاکستان میں یہ معیار ہے صحافت کا۔ قبل اس کے کہ میں اپنے چہرے سے پسینہ صاف کر سکتا، ایک مصری صحافی نے ایک اور جملہ چست کیا۔ "شمیم کو ابتدائی ٹریننگ بھی الطاف صاحب نے دی ہے۔" اسی طرح "بولٹ" "نٹس" "ان اور آؤٹ" وغیرہ کی

ہیڈلائنوں سے تمہارا کیا مطلب ہے میں آج تک نہ سمجھ سکا۔
میرا خیال ہے کہ یہ تمام سرخیاں تمہاری لگائی ہوئی نہ ہوں گی، تمہارے معاون مدیروں کی ہوں گی۔ خیر ان کا بھی کیا قصور ہے۔ کچھ دن پہلے تو وہ بیچارے پروف ریڈرز تھے۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ ان بے چارے پروف ریڈروں کو اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا کر دو دو ہزار تنخواہوں پر لگا دیا۔ غریبوں کے کام آنا بہت ثواب ہے۔

شمیم تمہاری ذہانت کو داد دینی پڑتی ہے کہ تم نے بے شمار صحافیوں کو اپنے اخبار سے نکال باہر کیا اور تمہارا عوامی حکومت میں بھی بال بیکا نہ ہوا۔ منہاج برنا، اشفاق بخاری، عبدالحمید چھاپڑا، مسعود اللہ خان اور حسین نقی وغیرہ کو نکال پھینکا۔ لیکن تمہاری کرسی میں کوئی بھونچال نہ آیا۔ کوئی جھٹکا نہ لگا۔ آدمی گہرے نکلے۔ اور شریف آدمی مثلاً اشتیاق حسین، زوار حسن اور انوار منصوری خود ہی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

مگر ایک بات ہے، ان لوگوں کی موجودگی سے تمہارے اخبار کو چار چاند لگ جاتے۔ لیکن یہ قابل لوگ بھلا پھر تمہیں کہاں گھاس ڈالتے۔

تم نے بھی ایوب خان کی پالیسی اختیار کی کہ "جی ہاں" کہنے والے صحافیوں کو اپنے گرد اکٹھا رکھا۔ ایک احمد حسین بچا تھا تو اسے راولپنڈی بھیج کر چھٹی پالی۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

"غنی" بھائی سے پچھلے ہفتے ملاقات ہوئی تھی۔ بہت خوش تھے کہ تم نے ان کے کمسن فرزند کو اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا۔ یہ تمہاری ہی ذہانت تھی کہ تم نے کم عمری میں اسے اس مرتبہ کو پہنچایا۔

تمہارے پاس لے دے کر محمد علی صدیقی ہے جو لکھ پڑھ سکتا ہے۔ خدا جانے اس کا تمہارے ساتھ کیا حال ہو رہا ہو۔ واپسی خط تحریر کرنا۔

اور ہاں! یہ اداریے تم کس قسم کے لکھتے ہو، اکثر اداریے پڑھتا ہوں، گریباں چاک کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اداریہ کو کئی بار پڑھ لو تو نتیجہ یہی نکلتا ہے۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

اچھا ہوا کہ خدا نے ہمیں واپس بلا لیا، ورنہ برخوردار تم سے دست گریباں ہو جاتے۔ اپنے اداریوں میں انجیل اور شیکسپیئر کے ڈراموں سے چرائے ہوئے جملوں کو اس قدر غلط اور بے موقع استعمال کرتے ہو کہ خون کھولنے لگتا ہے۔ اداریوں میں اردو کے اشعار کا بے محل استعمال، پڑھنے والوں پر ایک جنونی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہاں جنت میں باتیں مجھے سننا پڑتی ہیں۔

کل ہی بات ہے کہ شاعر مصطفےٰ زیدی نے طنزاً مجھے ایک خط لکھا۔ اور ساتھ ہی ایک اداریہ لکھ کر بھیجا کہ برخوردار الطاف حسین صاحب اس کی تصحیح فرما کر واپس کر دیجئے۔ عنوان تھا ——— BRING THE BIHARIS BACK اور یہ اداریہ شروع ہوا تھا۔ انہی کے اپنے شعر سے:

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

میں سمجھ گیا کہ زیدی نے تمہارے اداریوں پر طنز کیا ہے ورنہ وہ اس سنجیدہ مسئلے کے ساتھ ایسا شعر کیوں لکھتے۔

شمیم یہ حقیقت ہے کہ تمہارا عنوان کچھ ہوتا ہے عبارت کچھ ہوتی ہے۔ اپنے اداریوں میں خدارا مسائل سے جھگڑنا چھوڑ دو۔ وہ الفاظ ایسے استعمال کرو جو عام فہم ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بڑے بڑے الفاظ سے تم پرویز لاری کو مرعوب کر چکے ہوگے۔ اب یہ طرز تحریر چھوڑ دو۔

لاری کا ذکر نکلا تو ظہیر الحسن لاری یاد آ گئے۔ ہمارے پڑوس میں ہونے والی اکثر ادبی نشستوں میں لوگ تمہاری شکایت ان سے کرتے ہیں کہ صاحب آپ نے ایک پاگل ایڈیٹر کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ وہ ہنس کر کہہ دیتے ہیں کہ میرا بھتیجہ پرویز لاری ابھی نوجوان ہے۔ ضدی ہے۔ اس کی ضد ہے، خواہ اخبار برباد ہو جائے وہ شمیم کو نہیں نکالے گا۔ ویسے بھی جسٹس لاری صاحب یہاں آ کر دنیاوی مسائل پر بہت کم بحث کرتے ہیں۔

تم پرویز کو قابو میں رکھو۔ تمہاری نوکری سے تو بے شمار غریبوں کی روزی وابستہ ہے۔ ہمیں تو معلوم ہے کہ ان غریبوں کو دو دو ہزار روپے کی نوکریاں کون اخبار دے گا۔

فقط

خیر اندیش ۔ الطاف حسین

مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۷۳ء

بقیہ: اقبال

آج دنیائے اسلام میں خرد افروزی (ENLIGHT-ENMENT) کی بے حد ضرورت ہے۔ یہ لُبِ لباب ہے کتاب کے نویں باب کا، بلکہ اس پوری کتاب کا، اور ہم اس میں اپنے سکالر سید علی عباس جلالپوری سے حرف بحرف متفق ہیں اور اس بات پر مطمئن ہیں کہ وہ دوسروں کو اس ضرورت سے آگاہ کر کے خود ایک طرف نہیں بیٹھ گئے۔ بلکہ آج خرد افروزی کے ضمن میں جتنا کچھ بھی لکھا جا رہا ہے، اس میں خود ان کی مشارکت سب سے زیادہ ہے۔ ان کی یہ کتاب، اور اس سے پہلے ان کا صوفی شاعر وارث شاہ کے فن کا وہ خوبصورت مطالعہ نیز "روایات فلسفہ" اور "روح عصر" جو آج کے نوجوان لکھنے والوں کے لیے اقتباسات کے ایک غیر مختتم ذخیرے کا کام دے رہی ہے۔ یہ سب ان کی طرف سے خرد افروزی کے سلسلے ہی کی مساعی ہیں، اور اب اگر کوئی کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ انہوں نے اپنے وسیع مطالعے اور طویل تجربات کی روشنی میں اس زندگی اور کائنات کے بارے میں جو کچھ سوچ رکھا ہے، دوسرے لفظوں میں انہوں نے اپنا جو نظام فکر اور فلسفہ حیات مرتب کر رکھا ہے، اسے وہ ہمارے سامنے لے آئیں اور سقراط کی طرح اپنے گرد ہم جیسے حقیقت کے متلاشیوں کا مجمع لگائیں۔ سید صاحب اب تک ہمیں دوسرے حکماء اور فلاسفہ کی باتیں سناتے رہے ہیں، اب وقت ہے کہ وہ ہمیں اپنی باتیں سنائیں اور زہر کا پیالہ پینے سے نہ ڈریں۔ انہیں اپنی تحریروں کے ضمن میں اب تک جو کچھ سننا پڑا ہے وہ بھی اپنی تلخی میں حنظل سے کچھ کم تو نہیں ہے!

اس امر سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ہمارا علیحدہ تشخص صرف اسلام کی بدولت ہی ہے، اور ہم صرف مسلمان کی حیثیت سے بطور ایک قوم کے زندہ رہ سکتے ہیں، لیکن اسلام کے محافظوں اور متولیوں نے اس دین کو جس گھٹن میں مبتلا کر رکھا ہے، اس سے نباہ کرنا آج کے زمانے میں بے حد دشوار ہے، اور اس گھٹن کو قائم رکھ کر ہم کبھی دن کی روشنی دیکھنے کی توقع نہیں کر سکتے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ آج اسلام کی اس بے اثری کے بارے میں کھل کر سوالات اٹھائے جائیں، سائنٹیفک انداز میں بحث و فکر کی جائے، اور اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے کہ اسلام کا نام لینے والے آج دنیا میں ہر جگہ پسماندہ اور خوار کیوں ہیں، آج انہی میں کیوں سب سے زیادہ بے ایمانی، کام چوری اور ریاکاری پائی جاتی ہے، آج انہی کی اجتماعی ہیئتیں کیوں ہر جگہ انتشار اور بدنظمی کا شکار ہیں؟ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوالات پوری آزادی اور بے خوفی کے ساتھ اٹھائے جانے چاہئیں، اور کسی تعصب کے بغیر، علم و سائنس کی روشنی میں ان کا جواب تلاش کیا جانا چاہیئے۔ یہ اس دور کا علم کلام ہوگا، جس کی آج ہم مسلمان کہلانے والوں کو اشد ضرورت ہے!

اقبال کے علم کلام کے ضمن میں سید علی عباس جلالپوری نے جو باتیں اس کتاب میں کی ہیں، انہیں پڑھ کر کچھ اس طرح کا سودا انسان کے ذہن میں سماتا ہے اور کوئی شک نہیں کہ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر ہماری سوچ کے کھڑے پانی میں ایک بھاری پتھر پھینکا ہے۔

سیالکوٹ

کرسچن ہائی اسکول میں بدعنوانیاں

الفتح رپورٹ

نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے وقت بڑے بڑے دعوے کئے گئے تھے۔ مگر اب جب کہ اس تعلیمی پالیسی کو نافذ ہوئے چھ ماہ گزر گئے ہیں اور نتائج منظر عام پر آنے لگے ہیں۔ تو کچھ ایسا یقین ہونے لگا ہے کہ ہم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے چلے آئے ہیں۔ اور نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے وقت جو بلند بانگ دعوے کئے گئے تھے وہ محض سراب تھے۔

مسیحی تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینے سے پیشتر بھی محب الوطن پاکستانی مسیحی ان اداروں کے استحصالی گروہ کی چیرہ دستیوں سے نالاں تھے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت ایسے لوگوں کے ماضی کو اچھی طرح کنگالنے کے بعد انہیں کوئی اہم ذمہ داری سونپتی مگر یہ استحصالی گروہ مختلف شکلوں میں ابھی تک ان اداروں میں موجود ہے۔ کرسچن گرلز ہائی اسکول حاجی پورہ سیالکوٹ کی ہیڈ مسٹریس مسز جوزف پہلے مسیحی تعلیمی بورڈ کے ممبران کی ناک کا بال تھی اور اس کے تعاون سے عوام کو استحصال اور جبر و تشدد کا شکار بنانے میں سرگرم عمل تھی اور آج انہیں نوکر شاہی کا تعاون حاصل ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اسی لئے کہ مسیحی تعلیمی بورڈ کے ممبران ہوں۔ یا ہیڈ مسٹریس یا نوکر شاہی ان سب کے طبقاتی اور معاشرتی رشتے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ان سب کی جنگ پہلے بھی غریب عوام سے تھی۔ اور آج بھی اِن کا رَن غریب عوام سے پڑا ہوا ہے۔

۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے کہ اس اسکول کی معلمہ مس غلام مسیح جب مسز جوزف کا دُم چھلا نہ بن سکی۔ تو مسز جوزف کا انتقامی جذبہ بھڑک اُٹھا۔ مسز جوزف نے اسکول کے فرنیچر کو پہلے تو خود ہی خُرد بُرد کرایا۔ پھر مس غلام مسیح پر یہ الزام لگا دیا کہ اس نے فرنیچر جلا دیا ہے۔ اس الزام کو ثابت کرنے کے لئے اس نے ایک ملازم فضل مسیح کو آلۂ کار بنایا اور اس سے ایک جھوٹی تحریر لکھوائی کہ "میں نے مس غلام مسیح کو فرنیچر جلاتے ہوئے دیکھا ہے" عنایت مسیح الیکٹریشن کو بھی ایسی تحریر دینے کے لئے کہا گیا۔ مگر اُس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ہیڈ مسٹرس کی رپورٹ پر یہ معاملہ جب تعلیمی بورڈ کے سامنے پیش ہُوا تو مسز جوزف اپنا الزام ثابت کرنے میں ناکام رہی۔ فضل مسیح نے اس بات کا اقرار کر لیا کہ اُس نے ہیڈ مسٹرس کے کہنے پر جھوٹا بیان دیا تھا۔ مسز جوزف کی سازش ناکام ہوئی تو اسے تعلیمی بورڈ کے سامنے خفت اٹھانا پڑی۔ پھر اس خفت کو مٹانے کے لئے مسز جوزف نے مس غلام مسیح کے روبرو کلامِ تقدس پر عہد کیا کہ وہ اس کے خلاف کبھی انتقامی رویہ اختیار کریں گی۔

لیکن انہوں نے سلامت مسیح کو ایسی تحریر نہ دینے کی پاداش میں ملازمت سے علیحدہ کر دیا پھر چند دنوں کے بعد مسز جوزف نے مسٹر عنایت مسیح الیکٹریشن کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ اُس کا گناہ بھی صرف یہ تھا کہ اس نے مسز جوزف کے کہنے پر مس غلام مسیح کے خلاف جھوٹی تحریر دینے سے انکار کیا تھا۔ اس طرح دو ملازمین ہیڈ مسٹریس کی سازشوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ عنایت مسیح پندرہ سالہ پرانا ملازم تھا۔ اس نے تعلیمی بورڈ کے روبرو اپنی بحالی کے لئے اپیل دائر کی۔ مگر تعلیمی بورڈ نے ہیڈ مسٹریس کے جھوٹے وقار کو تحفظ دینے کی خاطر مسٹر عنایت مسیح کی برطرفی کو جائز قرار دے دیا۔ یہ سب کچھ مارشل لاء ضابطہ ۱۱۸ کی موجودگی میں کیا گیا۔ جبکہ قانونی طور پر مسٹر عنایت مسیح کی برطرفی کا کوئی جواز نہ تھا۔

مسز جوزف کی نظروں میں اس ناکامی کا ذمہ دار اسکول کا ایک نگران مسٹر والٹر ظہور الحق تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر مس غلام مسیح کو مسٹر والٹر کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اُسے یقیناً ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ لہٰذا مسز جوزف نے مسٹر والٹر کو بھی انتقامی جذبے کے تحت طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔

مسز جوزف نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے اپنی جیٹھانی جو کہ وزیر آباد میں ملازم تھی اُسے اپنے اسکول میں لے آئیں اس کے علاوہ اپنی ایک بہن جو کہ کسی کالج میں زیر تعلیم تھی اُسے بھی اِسی اسکول میں بطور ٹیچر ملازم رکھ لیا۔ اپنا تمام خاندان جس میں اس کا سسر اور دیور اور دیگر رشتہ دار تھے۔ سب کے سب اسکول سے ملحقہ کوٹھی میں رہائش پذیر ہو گئے۔ اب سازشوں کا دوسرا دور شروع ہُوا۔ مسز جوزف نے جب اپنے گروپ کو اچھا خاصا مضبوط کر لیا تو پھر اسکول کی طالبات میں پارٹی بازی کے جراثیم پھیلانے شروع کر دئے ایک دن ایسا بھی آیا اس نے کلامِ مقدس پر ہاتھ رکھ کر کئے ہوئے عہد کو پامال کرتے ہوئے ہوسٹل کی طالبات کو اشتعال دلا کر مس غلام مسیح کے خلاف ہڑتال کرا دی۔ پھر مارشل لاء ضابطہ ۱۱۸ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اُسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔

تعلیمی بورڈ کے سامنے مسٹر والٹر حق اور مس غلام مسیح کی اپیلیں پیش ہوئیں۔ تو سارے کے سارے معاملے میں ہیڈ مسٹرس کو قصور وار ٹھہرایا گیا۔ مس غلام مسیح کو بحال کر دیا گیا۔ مسٹر والٹر حق کی اپیل کے سلسلے میں ہیڈ مسٹریس جو گذشتہ ایک سال سے اسکول کی مینجر بھی تھی۔ اُسے نا اہلی اور انتظامی امور میں دھاندلیوں کی بنا پر صرف ہیڈ مسٹریس ہی رہنے دیا گیا۔ مینجر شپ کے اختیارات اس سے واپس لے لئے گئے، اس کے علاوہ بورڈ کے ممبران نے مسٹر والٹر حق اور مس زیب اختر سکنڈ مسٹریس کی موجودگی میں مسز جوزف کو بڑی سخت قسم کی وارننگ دی، ہیڈ مسٹریس نے اِسے اپنی توہین تصور کیا۔ پہلے مس غلام مسیح اور مسٹر والٹر حق زیرِ عتاب تھے اب مس زیب اختر بھی زیرِ عتاب آگئیں۔

دوسری طرف سیالکوٹ کے عوام کے ساتھ مسز جوزف کا برتاؤ انتہائی تحکمانہ اور نفرت انگیز تھا۔ تعلیمی ماحول بڑا گندہ تھا۔ عوام نے متعدد شکائتیں کیں اخبارات کے ذریعے بھی بے قاعدگیوں اور دھاندلیوں کی نشاندہی کی گئی مگر مسز جوزف نے اپنی روش نہ بدلی۔

یہ تمام واقعات جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، اس وقت سے تعلق رکھتے ہیں جب اس تعلیمی ادارے کو قومی تحویل میں نہیں لیا گیا تھا۔ اب اسی ادارے کو قومی تحویل میں لینے کے بعد جو دھاندلیاں مسز جوزف نے کی ہیں، ان کی روداد ملاحظہ فرمائیں اور نتیجہ خود ہی نکالیں کہ نئی تعلیمی پالیسی سے کس قدر اصلاحِ احوال ہوئی ہے۔ مرض بڑھا ہے یا کم ہوا ہے۔

اس تعلیمی ادارے کو قومی تحویل میں لینے کے دوسرے ہی دن مسز جوزف اپنے اہل و عیال اور نوجوان دیوروں کی ٹیم

کے ساتھ ہوسٹل کی ملحقہ کوٹھی میں آوارد ہوئی۔ جو تعلیمی بورڈ نے عوام کی شکایت پر خالی کرائی تھی۔ ہنگامہ آرائیوں کا پرانا کھیل پھر سے شروع کر دیا گیا۔ پہلے سابقہ تعلیمی بورڈ کے ممبران کا تھوڑا بہت خوف تھا۔ اب اس کی نوکری پکی ہو چکی تھی۔ نوکر شاہی کو جو رپورٹ اس نے لکھ دی، اسے نوکر شاہی نے آنکھیں بند کر کے درست تسلیم کر لیا۔

مس غلام مسیح جو اس ادارے کی پندرہ سالہ پرانی ملازمہ تھی، اسے اسکول کے ملازموں کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔ وہ پہلے افسران کے دفاتر کے چکر لگاتی رہی پھر بے شمار درخواستیں حکام بالا کو ارسال کیں۔ مگر آج تک کسی ایک کا جواب تک نہیں ملا۔ مس زیب اختر اس تعلیمی ادارے سیکنڈ مسٹریس تھی اور بی۔ ایڈ اساتذہ میں سب سے سینئر تھی۔ ہیڈ مسٹریس نے نوکر شاہی کی ملی بھگت سے اپنی ایک جی حضوری کو سیکنڈ مسٹریس بنوا دیا۔ پھر اسکول کا ایک اجلاس بلا کر طالبات کی موجودگی میں مس زیب اختر کی خوب تذلیل کی گئی۔ اس پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ مس زیب اختر کو ماہ فروری اور مارچ کی تنخواہ دینے سے صاف انکار کر دیا گیا۔ وہ کام اسکول کا کرتی ہے مگر اپنے اخراجات کا بوجھ بوڑھے باپ کے کندھوں پر ڈالتی ہے۔ اس کھلی دھاندلی کے خلاف مس زیب اختر نے کئی درخواستیں دیں۔ ذاتی طور پر افسران سے خود بھی ملی، مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا ہے۔

اپنے منصب کے جاہ و جلال اور اختیارات کی وسعت کے لئے مسز جوزف خوب ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ملازموں کو ہراساں کیا جا رہا ہے۔ اپنے کلاس ون افسر ہونے کا رعب دکھایا جا رہا ہے۔ مگر طالبات کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ ہائی کلاسز کی طالبات کو حساب اور الجبرا سارا سال نہیں پڑھایا گیا۔ وہ خود کوئی کلاس نہیں لیتی۔ اس کی جگہ اس کی بہن پڑھاتی ہے۔ تعلیم کا معیار دن بدن گر رہا ہے۔ طالبات کو گروہی سیاست میں الجھایا جا رہا ہے۔

عوام کا یہ عالم ہے کہ ہیڈ مسٹریس کو ملنے کے لئے کئی کئی گھنٹے دروازے پر کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ لیکن ہیڈ مسٹریس کا کسمر برآمدے سے برآمد ہوتا ہے اور دیکھ کر اندر چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد اس کا دیور نمودار ہوتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ محترمہ آرام کر رہی ہیں۔ اس کے باوجود بھی جب ملنے والا ڈٹا رہتا ہے تو چار و ناچار ہیڈ صاحبہ باہر آتی ہیں اور آتے ہی غریب پر برس پڑتی ہیں۔ اور پھر کہا جاتا ہے کہ اس وقت دفتر بند ہے جب دفتر کھلے گا تو پھر آئیں۔

عوامی مطالبے کے پیش نظر پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے اتفاق رائے سے ایک قرارداد پاس کی جس کے ذریعے ڈاکٹر عبدالخالق وزیر تعلیم سے استدعا کی گئی کہ مسز جوزف کو فوری طور پر اس ادارے سے تبدیل کیا جائے۔

اس کے بعد عوام کا ایک وفد مسٹر محمد اکبر منہاس ایم پی۔ اے سیالکوٹ کی قیادت میں ڈاکٹر عبدالخالق وزیر تعلیم پنجاب سے ملا، اور انہیں تمام حقائق سے آگاہ کیا۔ انہوں نے مسز جوزف کے تبادلے کے فوری احکام جاری کر دیئے۔ مگر دو ماہ گزرنے کے باوجود بھی لاہور سے سیالکوٹ تک یہ حکم نامہ نہیں پہنچ سکا۔ سنا ہے کہ کسی وزیر کی بیگم صاحبہ نے یہ تبادلہ رکوا دیا ہے۔ کیونکہ اس محترمہ کے ہیڈ مسٹریس کے ساتھ ذاتی مراسم ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پیپلز پارٹی کے دور میں بھی علاقے کے ایم۔ پی۔ اے کا مطالبہ زیادہ مستعد ہے یا کہ ذاتی مراسم۔

ہیڈ مسٹریس اور نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ کا مقصد عوام میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کرنا اور نئی تعلیمی پالیسی کو سبوتاژ کرنا ہے۔ اس کا سد باب کرنا حکومت کا کام ہے۔

بقیہ: شکاگو کا پرچم

طاقت اُسے دبا نہیں سکتی۔ موجودہ دور دنیا بھر کے کسانوں مزدوروں اور دیگر محنت کشوں کا دور ہے۔ سرمایہ دار طاقتیں پے در پے شکستیں کھا رہی ہیں۔ محنت کشوں کی تحریک کامیابیوں اور کامرانیوں کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ بیسویں صدی دنیا بھر کے بہادر مظلوم عوام کی فتح کی نوید لے کر آئی ہے۔ زارِ روس کی فرعونیت بمعہ اپنے تمام مظالم کے خاک میں مل چکی ہے۔ مشرقی یورپ کے متعدد ممالک میں محنت کش راج قائم ہو چکے ہیں۔ چین، کوریا اور ویٹ نام میں بہادر غیور کسان برسر اقتدار آ چکے ہیں۔ ہمارے بھائی الجزائر کے مسلمان اپنے وطنِ عزیز سے فرانس کو بزور نکال باہر کر چکے ہیں۔ سرمایہ داری کا دھپنے خان، امریکہ سرمایہ دار چانگ کائی شیک کو چھوڑ کر چین کے کسان مزدور راج کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا ہے۔ عرب الفتح کے بہادر گوریلے اسرائیل اور سامراج کو ناک چنے چبوا رہے ہیں۔ افریقہ کے محنت کش حبشی گورے یورپ کا استحصالی جوا اتار پھینک رہے ہیں۔ لاطینی امریکہ میں کامیاب کسان مزدور تحریک جاری ہے۔ پاکستان کے کسان مزدور بھی دنیا بھر کے محنت کشوں سے کسی صورت میں پیچھے نہیں ہیں۔ گذشتہ انتخاب میں انہوں نے سرمایہ داروں، جاگیر داروں کو شکست فاش دی۔ لیکن محنت کشوں کی حالت ابھی نہیں بدلی — جاگیردار بدستور استحصال کر رہے ہیں۔ اغوا، رسہ گیری جوں کی توں ہے۔ آڑھتیوں اور ذخیرہ اندوزوں نے مہنگائی کی شکل میں جسم کا ایک ایک قطرۂ خون نچوڑ لیا ہے۔ کارخانہ دار گراں مصنوعات کے شکل میں عوام کا کم اور اُجرت کی شکل میں مزدور کا استحصال بدستور کئے ہوئے ہے۔ قانون ساز ادارے جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ انتخابات عام آدمی کے مسائل کا حل ثابت نہیں ہوئے۔ کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کی جدوجہد جاری ہے جاری رہے گی جب تک استحصال کا نام و نشان نہیں مٹا دیا جاتا۔ مزدور اپنی ان تھک جدوجہد سے ایک نیا سویرا اُبھاریں گے۔ محنت کشوں کی معاشی اور سیاسی آزادی اور خوش حالی کا سویرا۔۔۔

چکوال

ایم۔ اے کی کلاسوں کے اجراء کا مطالبہ

گورنمنٹ مڈل اسکول ڈھڈیال کے جلسہ تقسیم انعامات و یوم والدین کی صدارت کرتے ہوئے چیئرمین ڈسٹرکٹ ایجوکیشن کمیٹی جہلم مسٹر مسعود الحسن بھٹی ایڈووکیٹ نے خطبۂ صدارت میں والدین پر زور دیا کہ وہ بچوں کی نگہداشت اور سیرت و کردار کی تشکیل پر زیادہ توجہ دیں۔ کیونکہ اگر ہم اپنی نئی نسل کی صحت مند خطوط پر تربیت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ قوم کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔ اور ہم ایک عظیم قوم کی حیثیت سے دنیا میں سرفراز ہو سکیں گے یہی وجہ ہے کہ حکومت نے تعلیمی اصلاحات کو اولیت دی اور طلبہ کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیمی مواقع پہنچانے کے لئے مڈل تک تعلیم مفت کر دی اور نجی تعلیمی اداروں کو قومیا لیا گیا۔ جس سے طلبہ اور اساتذہ یکساں طور پر مستفید ہو رہے ہیں تعلیم کے بغیر کوئی فرد بھی اپنے انفرادی اور قومی تشخص کے احساس سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ اس سے تعلیم بالغاں پر بھی زور دیا جا رہا ہے، تاکہ ہمارا قومی شعور اجاگر ہو سکے۔ جس کے نتیجہ میں ہماری ہمہ جہتی ترقی ممکن ہو سکے۔ مسٹر بھٹی نے مدارس کی عمارتوں کی تعمیر اور مرمت کے سلسلے میں بتایا کہ موجودہ ضلعی ورکس کونسل کے بجٹ میں اس مد میں ہزاروں روپے رکھے گئے ہیں اور اسکولوں میں کھیلوں کے لئے گراؤنڈ فراہم کرنے کے لئے بھی ضروری اقدام

الفتح

کئے جا رہے ہیں۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب باغ حسین کمال نے سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ کی ہمہ جہتی تربیت اور سیرت و کردار کی تشکیل کے لئے محض مذہبی کتابوں کی تدریس ہی کافی نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعہ ہی اس مقصد کو بہتر طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

گورنمنٹ کالج کے طلبہ کے مسائل

گورنمنٹ کالج چکوال کے طلبہ کے چند ایسے مسائل ہیں جن کے حل کے لئے وہ برسوں سے کوشش کرتے آ رہے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں جن کے حل میں تیشہ گراں اور جوئے شیر لانے کا عمل ضروری ہو۔ سیدھے سادے چند مسائل ہیں جو نہ تو وقت طلب ہیں اور نہ ہی زر طلب۔ کچھ وقت طلب ضرور ہیں۔ مگر اتنا وقت تو طلبہ کی ہاہا کار میں ہی بیت گیا ہے۔ جلسہ تقسیم انعامات کی تقریب پر جبکہ مرکزی وزیر محنت یہاں تشریف لائے اور اسٹوڈنٹس یونین کے صدر چوہدری ظفر نے کہا کہ یہاں ایم۔ اے کی کلاسوں کا اجرا عمل میں لایا جائے۔ سائنسی تعلیم کے لئے مستقل اسٹاف رکھا جائے۔ لڑکیوں کے لئے علیحدہ کالج قائم کیا جائے۔ ہوسٹل کے لئے تنگ و تاریک و بوسیدہ اصطبل نما عمارت کی جگہ نئی عمارت تعمیر کی جائے۔ طلبہ کو بسوں میں آنے جانے کے لئے ہر ممکن سہولتیں مہیا کی جائیں۔ ان مطالبات میں کوئی ایسی پیچیدگی پنہاں نہیں، جسے دور کرنے کے لئے حکومت کی راہ میں کوئی دقت پیش آتی ہو۔ طلبہ کے مسائل کو مقامی حکام اپنے حلقے کے ایم۔ این۔ اے کے ذریعے جلد از جلد حل کرانے کی جدوجہد کریں۔ تاکہ طلبہ کو یکسوئی حاصل ہو۔

ہیڈ ماسٹروں کے مطالبات

ایک ماہ پیشتر مڈل اسکول ہیڈ ماسٹرز ایسوسی ایشن کے قیام کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان نے کچھ اس قسم کے مطالبات پیش کئے۔ اے۔ ڈی۔ آئی صاحبان کی بالادستی ختم کی جائے۔ فنڈز کے استعمال کے مکمل اختیارات دیئے جائیں۔ نائب مدرس کی رخصت کی منظوری کا اختیار دیا جائے۔ نیز ماتحت مدرسین کی رپورٹ ان کی متعلقہ جماعتوں کے معائنہ اور ترقی وغیرہ کے اختیارات ہیڈ ماسٹروں کو دیئے جائیں۔ ان مطالبات سے نائب مدرسین آتش زیر پا ہو گئے۔ انہوں نے مڈل اسکول فرید کسر میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا جس کی صدارت چوہدری محمد حسین نے کی۔ جلسے میں بی۔ ایڈ سی۔ ایس وی اور جے وی اساتذہ نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی۔ جس میں کہا گیا کہ ہم ہیڈ ماسٹرز ایسوسی ایشن کے قیام کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے مطالبات کی منظوری سے ماتحت مدرسین کو گوناگوں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے محکمہ تعلیم کے ارباب بست و کشاد سے اپیل کی کہ اس قسم کی غیر قانونی تحریکات کا فوری طور پر سدِ باب کیا جائے ادھر ہیڈ ماسٹر صاحبان نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ چند اے۔ ڈی۔ آئی ان مطالبات کو اپنی افسر شاہی کی ہوا کو اکھڑتے کا سندلیسہ سمجھ کر اپنے سیدھے سادے ماتحتوں کو آگے کھڑا کر رہے ہیں۔

سوّروں کی ہلاکت کی اپیل

چکوال کے مشرقی مواضعات نور پور۔ دھڑ ماچھی۔ ڈھوک ہمون۔ تکیہ شاہ مراد۔ جنڈیال فیض اللہ۔ جنڈیال محمود۔ پنڈی گجراں۔ پخندی بسر۔ شاہ پور۔ ناروں۔ جگرالہ۔ ترپال زیریں۔ ترپال بالا۔ موہڑہ ستان۔ موہڑہ بخاراں اور ملحقہ علاقہ کے عوام نے صدر پاکستان اور گورنر پنجاب سے اپیل کی ہے۔ کہ وہ رکھ دلجبہ کے موذی جانوروں کو ختم کرانے کا فوری اہتمام کریں۔ کیونکہ یہ موذی جانور پہلے تو صرف فصلوں کو تباہ کر رہے تھے مگر اب انہوں نے مویشیوں اور انسانوں کو بھی اپنی چیر پھاڑ کے دائرہ میں شامل کر لیا ہے۔ رکھ دلجبہ ایوب خان کی پسندیدہ شکارگاہ تھی۔ سولہ برس سے اس رکھ میں کسی دوسرے انسان کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ زیر درختی کے ساتھ ساتھ یہاں جنگلی سوّروں کے ریوڑ کے ریوڑ پلنے لگے۔ ان کی ہلاکت کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ یہ جانور جب ملحقہ زمینوں کے کھیت اجاڑ چکے۔ تو پھر انہوں نے مویشیوں اور انسانوں پر اپنے جبڑے تیز کرنے شروع کر دیئے۔ اور نشانہ بازوں کی ٹیمیں بھیجی جائیں۔ اس کے ساتھ رکھ دلجبہ کا متعلقہ رقبہ ملحقہ مواضعات میں تقسیم کر دیا جائے۔ تاکہ وہ اُسے پھر سے آباد کر سکیں۔

فنّی ادارے کے قیام کا مطالبہ

چکوال کے عوام نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اس علاقہ کے مرکزی مقام پر کوئی فنّی ادارہ قائم کیا جائے۔ تاکہ نوجوان فنون کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے نان و نفقہ کے لئے کسی کے دستِ نگر نہ ہوں یہ علاقہ زرعی ہے۔ مگر خشک سالی کا شکار رہتا ہے۔ کوئی صنعتی ادارہ بھی یہاں نہیں۔ جہاں نوجوانوں کی کھپت ہو سکے۔ علاقہ کی غربت کے باعث اکثر طلباء اپنی ذہنی صلاحیتوں کے باوجود بیرونی شہروں میں جا کر فنی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ دور فنی اور سائنسی تعلیم کا دور ہے۔ طلباء صرف الیف۔ اے، بی۔ اے کر کے کوئی معقول روزگار حاصل نہیں کر سکتے۔ نتیجۃً وہ قوم اور ملک کے لئے بارِ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ اس علاقہ کی دفاعی اور فوجی خدمات کی اہمیت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اب بھی ۹۲ ہزار جیالے دشمن دشمن کی قید میں پڑے ہیں۔



انتظار احمد ٹی۔ ایچ نقوی، شمیم احمد، مہدی مرزا، حفیظ مرزا اور اخلاق احمد چشتی۔

یونین آف کمرشل آرٹسٹ کے انتخابات

۷ اپریل ۱۹۷۳ء کو یونین آف کمرشل آرٹسٹ کراچی کا عام اجلاس زیر صدارت جناب مہدی مرزا صاحب (ہاشمی کین) برائے انتخابات ۷۴۔۷۳ء منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل عہدیدار منتخب ہوئے۔

صدر شمیم احمد (لیڈ گروپ) نائب صدر اخلاق احمد چشتی (فائنہ) جنرل سیکرٹری حفیظ مرزا (پیراگون) جوائنٹ سیکرٹری انتظار احمد (اورینٹ) سیکرٹری نشر و اشاعت ٹی۔ ایچ نقوی (ایس۔ ٹی ایڈورٹائزنگ) اور خازن انوار احمد۔


روزانہ شیو — ہر بار ٹریٹ بلیڈ سے
ٹریٹ بلیڈ کے ساتھ اگر کریم سے بھرپور
زیادہ جھاگ والی ٹریٹ لادر شیونگ کریم استعمال
کی جائے تو شیو کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔
new
Treet
BLADE double edge
WAZIR ALI INDUSTRIES LTD
روزانہ پُرلطف شیو ——— ٹریٹ بلیڈ سے

بقیہ: احوالِ واقعی

حصہ لینے کے لئے قانونی ماہرین بھیجنے کی پیشکش کی تھی جسے بنگلہ دیش نے مسترد کر دیا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان مقدمات میں جنگی قیدیوں کو قانونی سہولتیں مہیا نہیں کی جائیں گی، من مانے فیصلے کئے جائیں گے۔ انصاف اور عدالت کا مذاق اڑایا جائے گا۔ حالانکہ بین الاقوامی اصولوں اور جنیوا کنونشن کے تحت بنگلہ دیش مقدمات چلانے کا کوئی قانونی جواز نہیں رکھتا۔

۲۰ اپریل کو حکومت پاکستان نے بھارت اور بنگلہ دیش کی اس نئی پیش کش کا جواب دیا جس کے اہم نکات یہ ہیں۔

● ۱۹۴۹ء کے جنیوا کنونشن کے مطابق جس پر خود بھارت نے بھی دستخط کئے ہیں۔ پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی غیر مشروط ہونی چاہیئے۔

● بنگلہ دیش کو پاکستانی جنگی قیدیوں پر جنگی جرائم کے الزام میں مقدمات چلانے کا اختیار نہیں کیونکہ یہ مبینہ مجرمانہ کارروائیاں پاکستان کے ایک حصے میں کی گئی تھیں اور کیونکہ مبینہ ملزم پاکستان کے شہری ہیں۔ اس سلسلے میں کسی ملک کا قطعی طور پر اپنے دائرہ اختیار سے دست بردار ہونا اس کی خود مختاری کے منافی ہے۔ البتہ پاکستان مبینہ ملزموں پر ایک عدالتی ٹریبونل میں مقدمہ چلانے کے لئے تیار ہے۔

● اگر بنگلہ دیش نے پاکستانی جنگی قیدیوں پر مقدمہ چلایا تو امن و مصالحت کی فضا مکدر ہو جائے گی۔

● حکومتِ پاکستان بنگالیوں کی واپسی کے انتظامات میں بھرپور تعاون کرے گی۔

● یہ افسوس ناک بات ہے کہ روزگار اور املاک چھین کر بہاریوں کو پاکستان جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

● ۱۷ اپریل کے اعلامیہ کی وضاحت اور شملہ معاہدے پر مزید عمل درآمد کے امکانات کا جائزہ لینے کے لئے بھارت اپنے نمائندے اسلام آباد بھیجے۔

بھارت نے پاکستان کی اس تجویز کو قبول کر لیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ وہ بھارت اور بنگلہ دیش کے مشترکہ اعلامیہ کی وضاحت کے لئے اپنے نمائندے اسلام آباد بھیجے۔ خبر رساں ادارے رائٹر کے مطابق بھارتی وفد کی قیادت پی۔ این ہکسر کریں گے۔ اور جب آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے تو اس وقت بھارتی وفد کی آمد کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی ہو گی۔

بی بی سی کے مطابق بھارت پاکستانی جنگی قیدیوں کو رہا کرنا چاہتا ہے۔ اور اسی نے بنگلہ دیش کو اس پر آمادہ کیا ہے۔ اس لئے توقع ہے کہ ہکسر سے مذاکرات کامیاب رہیں گے۔ اور اگست کے اوائل میں جنگی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔

حکومت کے قریبی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بھارت نے قید کے دوران پاکستانی جنگی قیدیوں پر جو اخراجات کئے ہیں اس کی ادائیگی لیبیا کرے گا۔ اس نے اس سلسلے میں حکومت پاکستان سے وعدہ کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ جنیوا کنونشن کے تحت ہر ملک کو اپنے جنگی قیدیوں پر خرچ کئے جانے والے اخراجات ادا کرنے پڑتے ہیں اور اس بل کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

بقیہ: سرورق کی کہانی

کے ساتھ ڈی پی۔ آر کا استعمال کیا گیا۔ گزشتہ دنوں پیپلز لیبر فرنٹ، راولپنڈی کے مقبول مزدور رہنما رفعت حسین باوا کو جس مذموم الزام کے تحت گرفتار کیا گیا، وہ نوکر شاہی کی دھاندلیوں کی ایک بہت واضح مثال ہے۔

پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں پاکستان کے مزدوروں نے جس بے مثال اتحاد اور یگانگت کا مظاہرہ کیا ہے، اس نے ان میں انقلابی رجائیت کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اب کوئی طاقت ان کے بڑھتے ہوئے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈال سکتی۔ دائیں بازو کے رجعت پسند سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ تمام جعلی سوشلسٹ بے نقاب ہو گئے ہیں، جو بار بار قلابازیاں کھاتے ہیں اور بار بار اپنے فطری 'اتحادیوں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔

ان گزشتہ تحریکوں نے مجموعی طور پر مزدوروں کی جدوجہد کو آگے بڑھایا ہے۔ بلاشبہ اس دوران ـــــ ان کی قیادت سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں، لیکن ہماری مزدور تحریک جس منزل پر ہے، اس میں ایسی غلطیاں ناگزیر ہیں۔ ہم تجربے سے ہی سیکھتے ہیں۔ البتہ اگر بار بار ان غلطیوں کا اعادہ کیا گیا تو یہ عمل موقع پرستی اور بدنیتی کی علامت ہوگا۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان تحریکوں سے مزدوروں کی جدوجہد کو نقصان پہنچا ہے، وہ تاریخی تقاضوں سے نابلد ہیں۔ پیش قدمی ـــ پسپائی، پسپائی ـــ پیش قدمی، جنگ لڑنے کا یہی اصول ہے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ لڑنے والے کی طاقت محدود ہو، اسے لازمی طور پر اس اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ دشمن آپ کو کبھی اس بات کا موقع فراہم نہیں کرے گا کہ آپ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دندناتے اس کی صفوں میں گھستے چلے جائیں۔ اپنی طاقت کا پوری طرح اندازہ کرنا چاہیئے، اور اسی کے مطابق اپنے حملے کی حدود کا تعین کرنا چاہیئے۔ بہت مشہور مثل ہے، "جتنی چادر دیکھو، اتنے پاؤں پھیلاؤ"۔ اگر اپنی قوت کا اصل سے زیادہ اندازہ لگایا جائے تو ہم مہم پسندی کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کے برخلاف اگر طاقت کا اصل سے کم اندازہ لگایا جائے تو ہم موقع پرستی کی دلدل میں پھنس جائیں گے۔ ہمیں ADVANCED نعرے نہیں دینے چاہئیں۔ چھلانگ لگا کر مقصد تک پہنچنے کی خواہش غیر سائنسی اندازِ فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔ مزدوروں کی گزشتہ تحریکوں کے دوران اس قسم کی متعدد غلطیاں سامنے آئی ہیں۔ اصولی طور پر تو سب اس نکتے سے متفق ہوتے ہیں، لیکن عمل شروع ہوتا ہے تو اضطراری کیفیات کے تحت وہ جلد بازی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں BACKWARD نعرے بھی نہیں دینے چاہئیں۔ معاشرہ ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتا ہے پیچھے کی سوچ رکھنے والے رجعت پسند ہوتے ہیں۔ اپنی طاقت کے مطابق صحیح وقت پر اور صحیح وزن کے ساتھ "ٹھیک ٹھیک نشانے" لگائے جائیں۔

گزشتہ تحریکوں کے دوران جو تجربات حاصل ہوئے ہیں، ان کا پوری دیانتداری کے ساتھ نچوڑ نکالنا چاہیئے۔ غلطیوں کی اصلاح کرنی چاہیئے اور مثبت پہلوؤں کو سامنے لانا چاہیئے۔ پرولتاریہ کا سب سے بڑا اتحادی کسان طبقہ ہے، جو ملک کی سب سے بڑی آبادی کی تشکیل کرتا ہے۔ پرولتاریہ کو اس سے قریبی روابط قائم کرنے چاہئیں، اور ان کے مسائل میں محبت اور خلوص کے ساتھ دلچسپی لینی چاہیئے۔ ان کے حقوق کے لئے آواز بلند کرنی چاہیئے۔ اخبارات میں ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف بیانات دینے چاہئیں اور جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے انہیں اپنی حمایت کا یقین دلانا چاہیئے۔ اس طرح یہ دونوں انقلابی طبقے روز بروز ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب آ جائیں گے۔ ان میں سے کوئی طبقہ الگ تھلگ رہ کر اس ظالمانہ نظام کے خلاف جنگ میں قطعی کامیابی حاصل نہ کر سکتا۔

گزشتہ سال کی اکتوبر تحریک میں دوسرے طبقوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بروقت اقدامات نہیں کئے گئے۔ چھوٹے دوکاندار، کلرک، وکیل، ڈاکٹر، صحافی، طلبار اور نچلے اور متوسط طبقوں کے دوسرے افراد کی قوت سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ طبقے بنیادی طور پر انقلابی نہیں ہوتے، اور عام طور پر اِدھر اُدھر ڈولتے رہتے ہیں، لیکن مجموعی طور پر ان کے جذبات کا دھارا مزدوروں کے مفادات کی طرف بہتا ہے۔ قانونی ذرائع سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

پروپیگنڈے کے کام پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ خاص طور پر جب مزدور حلقوں میں کوئی تحریک چل رہی ہو، اس وقت دوسرے طبقوں کو اس کی رفتار سے باخبر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ ان تمام طبقات کے مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مہنگائی اور بدعنوانیوں کے اس دور میں متوسط طبقے پر بڑا بوجھ پڑ رہا ہے، اور اس وقت ان میں انقلابی رجحانات تیزی سے ابھارے جاسکتے ہیں۔

گروہ بندی کی سیاست کا حصار تیزی سے ٹوٹ رہا ہے۔ یہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔ یہ عمل جتنی تیزی سے بڑھے گا، اسی رفتار سے مزدوروں کا اتحاد مضبوط ہوگا۔ عظیم تر اتحاد کی منزل قریب آ رہی ہے۔ پیشہ ور اور جاہ پسند مزدور لیڈروں کے ہتھکنڈے بری طرح ناکام ہو رہے ہیں۔ اب اگر ایک چھوٹے سے بھی کارخانے میں مزدوروں پر ظلم ہوتا ہے، تو اس کے خلاف پورے ملک کے مزدور حلقوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہی طبقاتی جذبہ ان کے عظیم تر اتحاد کی بنیاد ہے۔

آج جب کہ ملک بھر کے مزدور یکم مئی کے عظیم شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں، ان کو اندرونی اور بیرونی حالات پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوری احتیاط اور دور اندیشی کے ساتھ اپنی تدابیر کا تعین کرنا چاہیئے۔ سرمایہ دار نوکر شاہی کی مدد سے نئے ہتھکنڈوں کے ذریعے ان کو مغلوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امریکی سامراج ایک بار پھر ہمارے ملک کو اپنے چنگل میں پھانسنے کے منصوبے پر عمل کر رہا ہے۔ سوشل سامراج نے انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کی، اور وہ اب تک ہمارے خلاف جارحانہ پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے مسئلے پر اس نے کھل کر بھارتی توسیع پسندوں کا ساتھ دیا۔ چین واحد ملک ہے جو پورے خلوص کے ساتھ دوستی کا حق نبھا رہا ہے۔

اندرونی طور پر ملک دشمن عناصر پوری شدت سے انتشار پھیلانے میں مصروف ہیں۔ بے روزگاری، چور بازاری، رشوت ستانی، اقربا پروری، ذخیرہ اندوزی، اور مہنگائی کا بازار گرم ہے۔ ان حالات میں انہیں کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا ہے۔ برسرِاقتدار پیپلز پارٹی نے آئین سے اسلامی سوشلزم تک کا لفظ نکال دیا ہے، اس لئے سرمایہ دار اور جاگیردار اور شیر ہو گئے ہیں۔ عوام میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت منفی انداز میں علاقائی منافرت پھیلائی جا رہی ہے۔ مزدوروں اور ان کے دوستوں کو ایسے رجحانات کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور خالص طبقاتی بنیادوں پر تمام علاقوں کے مزدوروں کو، اور زیادہ تیزی کے ساتھ، ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا چاہیئے۔

دائیں بازو کی رجعت پسند قوتوں کے ساتھ ساتھ "بائیں بازو" کے جعلی سوشلسٹوں کو بھی بے نقاب کرنا ضروری ہے۔ یہ لوگ سوشلزم کا جھنڈا اٹھا کر سرمایہ داری کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں، پیپلز پارٹی کا "سوشلزم" مصلحت اور موقع پرستی کی طرف جھک گیا ہے۔ چند اصلاحات کو سوشلزم کا نام دینا کھلی دھاندلی ہے۔ سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں ہل ضرور گئیں، لیکن اس نظام کے حامیوں کو پیپلز پارٹی کے دامن میں پناہ مل گئی ہے۔

ایک گاؤں کے کنویں میں کتا گر گیا۔ گاؤں والے دوڑے دوڑے ایک لال بجھکڑ مولوی کے پاس پہنچے اور فتویٰ مانگا۔ مولوی نے آ کر کنویں کا معائنہ کیا۔ اور کہا "کنویں سے چالیس ڈول پانی نکال کر باہر پھینک دو، پانی پاک ہو جائے گا!" گاؤں والوں نے۔ ۴۰ ڈول پانی نکال کر باہر پھینک دیا کتا کنویں ہی میں رہنے دیا۔ پیپلز پارٹی کے سوشلزم کا بھی یہی رنگ ہے۔ اس نے معاشرے کے کنویں سے اصلاحات کے چالیس ڈول باہر نکال لئے، لیکن سرمایہ داری اور جاگیرداری کا کتا اب تک اندر پڑا اٹھر رہا ہے۔

یوم مئی شکاگو کے مزدوروں کے عظیم اتحاد اور اجتماعی قوت کی علامت ہے۔ آج جب ہم اس واقعے کی یاد مناتے ہیں تو اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنے اتحاد کو مضبوط بنائیں گے۔ اور اپنے معروضی حالات کی روشنی میں اپنی حکمتِ عملی وضع کریں گے اور موضوعی طور پر اس کی تکمیل کرنے کے لئے اپنی اجتماعی قوت کو پورے طور پر بروئے کار لائیں گے۔ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے کتے کو معاشرے کے کنویں سے ہم ہی باہر نکال سکتے ہیں۔

دنیا کے جن ممالک میں اب تک سرمایہ داری کا منحوس وجود موجود ہے ان کے مزدوروں کے لئے شکاگو کے مزدور اخبار کے گمنام صحافی کے الفاظ آج بھی روشنی بکھیر رہے ہیں۔

بہادری سے آگے بڑھے چلو،
لڑائی شروع ہو چکی ہے ——

مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد بے روزگار ہے۔ سرمایہ داری کے خونی پنجے قانون اور بے جان امن کے پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔

محنت کشو، اب تمہارا نعرہ یہ ہونا چاہیئے کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا!۔

—— (تمہاری جدوجہد) کی تاریخی اہمیت کو تو آنے والے زمانے میں تسلیم کیا جائے گا۔

بقیہ: طلوع (افسانہ)

"دیکھ تو رہا ہوں۔ اچھا تم یوں کرو... آ کر مجھ سے چمٹ جاؤ۔ ہم دونوں ایک جان ہو کر اس ظلمت کے خلاف آخری فتح تک لڑیں گے۔ آجاؤ۔ آؤ نا۔"

چھوٹا ستارہ کچھ دیر تھرتھراتا رہا اور پھر اپنے پیچھے مدھم سی لکیر چھوڑتا ہوا بڑے ستارے میں مدغم ہو گیا۔ سیاہ اندھیرے کے قدم تھوڑے سے رکے، اور پھر بڑھتے ہی چلے آئے۔ اکیلا ستارہ ان میں گھر گیا۔ آسمان پر اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ زمین پر کسانوں اور مزدوروں نے مایوسی سے سر جھکا لئے۔ لیکن جلد ہی اندھیرے کی دبیز تہہ میں دراڑ پڑ گئی اور اندھیرے کے اس لت پت سرخ ستارے سے ساری کائنات روشن ہو گئی۔ کسانوں اور مزدوروں نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے اپنے اپنے کام پر رخصت ہو گئے۔

حلقۂ قارئینِ "الفتح"

- آپ "الفتح" پڑھتے ہیں
- آپ کے علاقے میں کچھ اور لوگ بھی الفتح پڑھتے ہیں
- آپ آپس میں مِل کر ان موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے ہوں گے۔
- آپ اپنے علاقے کے مسائل پر بھی آپس میں گفتگو کرتے ہونگے، کچھ تجاویز بھی آپکے ذہن میں آتی ہونگی۔
- کیا آپ باقاعدگی سے اپنے اپنے علاقے میں مہینے میں ایک بار یا دو بار نہیں مِل سکتے۔؟ پھر ہمیں لکھیں کہ آپ نے کیا سوچا، کیا بحث کی، کیا تجاویز پیش کیں۔
- اس طرح مختلف علاقوں کے مسائل اور ان پر اپنے ہم خیال دوستوں کی سوچ بھی سامنے آئے گی۔

  ہم پھر سب مل جل کر پورے ملک کے مسائل پر بھی کچھ سوچ سکیں گے اور کچھ رائے قائم کر سکیں گے۔
- ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ "الفتح" کے مرکز سے کوئی صاحب آپ کے حلقے سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں آئیں۔
- آپ کا اس تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟
- کیا ملک کی سلامتی، عوام کی بہتری، غریب و مفلس عوام کے حقوق کے حصول کیلئے "الفتح" کے قارئین اس طرح ایک ٹھوس اور فعّال کردار انجام نہیں دے سکتے؟
- اپنی سوچ سے مطلع کرنے کے لئے ہمیں لکھیے۔

انچارج حلقۂ قارئین "الفتح"

ہفت روزہ "الفتح"، ۸۷۔ڈی، نرسری۔کمرشیل ایریا کراچی ۲۹۔فون: ۴۱۲۲۷۴

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
26 APRIL-3 MAY 1973